قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

اکتوبر ۱۹۵۸ء

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ

رسول اللہ (ص) نے فرمایا ہے کہ خبردار فتنہ واقعہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ص) اس سے کیونکر نجات ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا) حکم ہے اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا ہلاک کریگا اس کو اللہ۔ اور جس نے قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں ہدایت طلب کی گمراہ کریگا۔ اس کو اللہ؟ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔

(مشکواۃ بحوالہ ترمذی۔ دارمی)

شائع کردہ :-

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گل برگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

# طلوع اسلام

ٹیلیفون نمبر 7500
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ ۸ روپے
غیر ممالک سے ۱۴ شلنگ

اکتوبر سنہ ۱۹۵۸

جلد ۱۱ نمبر ۱۰

## فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| لمعات | | ۳ |
| مجلس اقبال | | ۹ |
| اسلام کی سرگزشت | (ڈاکٹر احمد امین مصری مرحوم) | ۲۳ |
| درزمانہ انحطاط | جناب سید اللہ بخش صاحب ایم اے ڈیرہ غازی خان | ۳۳ |
| حقائق و عبر | | ۴۴ |
| تعارف کتب | | ۵۳ |
| طلوع اسلام اور اسکے دفتر کے متعلق | | ۵۵ |
| جدید تصورات اور معاشری اقدار کی طرف سے اسلامی معاشرے کو دعوت مبارزت | (ڈاکٹر رچرڈ این فرائی (ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ) | ۵۷ |
| مسلمان کی پہچان کے اصول | (ڈاکٹر نان گرون بام پروفیسر کیلیفورنیا یونیورسٹی (امریکہ) | ۶۴ |
| رابطہ باہمی | | ۷۰ |
| صالحین کے کارنامے | | ۷۴ |
| پیش کش برائے طباعت لغات القرآن | | ۷۸ |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

آزادیٔ فکر و آراء بڑی نعمت ہے اور بنیادی حقوقِ انسانیت میں اس کا شمار بالکل بجا اور درست۔ لیکن اس حق کو کسی صورت میں بھی غیر مشروط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً کمیونسٹ پارٹی کا کوئی ممبر اگر کمیونزم کے خلاف اور سرمایہ داری کے حق میں پراپیگنڈہ شروع کر دے تو پارٹی اسے اس کی قطعاً اجازت نہیں دے گی۔ اس کی یہ دلیل کہ مجھے اپنی فکر اور رائے کے اظہار کا پورا پورا حق حاصل ہے، اس کے اس عمل کے لئے وجۂ جواز نہیں قرار پا سکتی۔ اسے اس کا تو پورا پورا حق حاصل تھا کہ وہ کیپٹل ازم اور کمیونزم میں آزادانہ تقابل کے بعد جس ازم کو چاہتا بر رضا و رغبت اختیار کر لیتا۔ لیکن (اس طریق سے) کمیونزم اختیار کرنے اور کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن جانے کے بعد اسے اس کا حق نہیں رہتا کہ وہ کمیونزم کے خلاف پراپیگنڈا کرتا پھرے۔ اگر کمیونزم اختیار کرنے کے بعد وہ کسی وقت دیکھے کہ یہ ازم اس کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے اور اس کا پہلا فیصلہ غلط تھا تو اس کے لئے صحیح طریق کار یہ ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو جائے[1]۔ لیکن اس کا طرزِ عمل تو کسی صورت میں بھی معقول اور قابلِ برداشت نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ پارٹی کا ممبر بھی رہے اور پارٹی کے مسلک کے خلاف پراپیگنڈہ بھی کرتا رہے۔

ہم نے کمیونسٹ پارٹی کا نام محض مثالاً لیا ہے ورنہ، جو اصول اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے کسی پارٹی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ یہ نہایت معقول اور اس کے ساتھ بالکل واضح۔ صاف اور سادہ اصول ہے، جسے ہر شخص صحیح تسلیم کرے گا۔

اسلام بھی ایک ازم ہے اور اس ازم کو اختیار کرنے والا ایک "پارٹی" کا ممبر بنتا ہے، جسے اُمتِ مسلمہ کہا جاتا ہے (اگرچہ اس "پارٹی" کی نوعیت کیفیت عام سیاسی پارٹیوں اور فرقہ بندیوں سے مختلف ہے)۔ وہ ہر شخص کو اس کا حق دیتا ہے کہ وہ دنیا کی مختلف ازمز (ISMS) کا بغور مطالعہ کرے اور دل کے پورے اطمینان اور ذہن کی کامل تسکین کے بعد جس ازم کو

---

[1] ہمیں معلوم نہیں کہ کمیونسٹ اپنی پارٹی کے ممبروں کو پارٹی چھوڑ جانے کا حق دیتے ہیں یا نہیں۔ لیکن ہم نے یہ چیز محض مثالاً بیان کی ہے کہ اسے اس کا حق ہونا چاہئے

صحیح سمجھے اسے برضا و رغبت اختیار کرلے۔ اگر اس نے اس طرح اسلام کو اپنے لئے منتخب کیا ہے تو وہ اُمت مسلمہ کا ممبر بن جائیگا۔ (جسے مروجہ اصطلاح میں مسلمان کہا جاتا ہے)۔ اگر اس کے بعد کبھی ایسا ہو کہ اسے اس ازم (اسلام) کی صداقت پر (کسی وجہ سے) یقین نہ رہے تو اسلام اس کا حق دیتا ہے کہ وہ جب جی چاہے اس "پارٹی" کی ممبر شپ (رکنیت) کو چھوڑ کر اسلام کے دائرے سے باہر چلا جائے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک یہ شخص اس پارٹی کا ممبر ہے اسے اس کا حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ ان اصول و مبانی کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے لگ جائے جن سے اسلام ترتیب پاتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں عجیب تماشا ہے۔ لوگ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور ان اصول و مبانی کی علانیہ مخالفت کرتے اور ان کے خلاف کھلے بندوں پراپیگنڈہ کرتے ہیں جن پر اسلامی معاشرہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ نہ ان میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ جس ازم کو صحیح نہیں مانتے اس سے کھلے بندوں الگ ہو جائیں اور نہ اتنی شرافت کہ وہ جس پارٹی کے ممبر ہیں اس کے اصول و قواعد کے خلاف لب کشائی نہ کریں۔ انھیں مسلمان کہلانے پر بھی اصرار ہے اور اسلامی اصولوں کے خلاف پراپیگنڈہ کرنا بھی اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ان میں نمایاں مثال ان پاکستانی مسلمانوں کی ہے جو وطن اور نسل کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کے داعی ہیں اور اس کے لئے دن رات پراپیگنڈہ میں مصروف رہتے ہیں۔

اسلام سے قبل دنیا کا نظام یہ تھا کہ قبیلوں اور قومیتوں کا مدار خون کے اشتراک، یا اس سے ذرا آگے بڑھ کر، وطن کے اشتراک پر رکھا جائے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ خدا کے اولین رسول نے بھی جو پیغام دیا تھا وہ اسلام ہی کا پیغام تھا لیکن ہم، بغرض افہام، اس وقت اسلام سے مراد، وہ دین لیتے ہیں جو نبی اکرمؐ کی وساطت نوع انسان کو ملا)۔ اسلام نے تقسیم انسانیت کے اس تصور کو باطل قرار دیا اور کہہ دیا کہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں، تفریق و تمیز کا ایک ہی معیار ہے اور وہ ہے آئیڈیالوجی کا فرق۔ اسی کو قرآن کفر اور ایمان کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے۔ دنیا کے تمام انسان جو وحی کی متعین کردہ آئیڈیالوجی پر یقین رکھیں، بلا لحاظ رنگ، خون، زبان، وطن، ایک برادری کے افراد اور جو لوگ اس سے انکار کریں وہ دوسری قوم سے متعلق۔ اس معیار کے علاوہ کوئی اور معیار تفریق و تقسیم اسلام کی رُو سے قابلِ قبول نہیں۔ اسلام کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جس کے متعلق طلوع اسلام گزشتہ بیس سال سے شرح و بسط کے ساتھ لکھتا چلا آ رہا ہے اور اس کی تائید و سند میں قرآن کریم کی بے شمار آیات پیش کر چکا ہے۔ اس مقام پر اس تفصیل کے اعادہ کی ضرورت نہیں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ قرآن کی اس بنیادی تعلیم پر خود نبی اکرمؐ نے عمل کر کے دکھایا اور دنیا کو بتا دیا کہ وطن اور نسل کے اشتراک کے علی الرغم، خالص آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر کس طرح ایک امت کی تشکیل ہوتی ہے۔ آپؐ مکہ میں پیدا ہوئے۔ قبل از اسلام تصور کے مطابق اشتراکِ وطن کی بنا پر، مکہ (بلکہ دیگر مقامات حجاز اور باقی عرب) کے رہنے والے آپ کے "ہم قوم" تھے اس سے آگے بڑھیے تو قریشِ مکہ اشتراکِ خون کی بنا پر نہ صرف حضورؐ کے "ہم قوم" بلکہ رشتہ دار تھے۔ لیکن آپ نے وطن اور نسل کے ان تمام رشتوں کو الگ ہٹا کر خالص آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک نئی قوم کی تشکیل فرمائی۔ قومیت کے اس جدید معیار کا نتیجہ تھا کہ مکہ کا رہنے والا حضورؐ کا چچا۔ ابولہب۔ (آئیڈیالوجی کے اختلاف کی وجہ سے) اس جدید قوم کے دائرے سے باہر تھا اور فارس کا سلمانؓ اور روم کا

صیہونیت (آئیڈیلوجی کے اشتراک کی بنا پر) اس کے اندر۔ قومیت کے اس جدید معیار کی بنا پر، اسلام نے عالم انسانیت میں ایک ایسا محیرالعقول انقلاب پیدا کر دیا جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی اور جس کا اعتراف ساری دنیا کے ارباب بصیرت کو ہے۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے جب ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں کا وقت آیا تو اسلام کے اس اساسی معیار قومیت کی بنا پر پاکستان کی تحریک وجود میں آئی۔ ملک میں ایسے مسلمان بھی موجود تھے جو اس تحریک کے خلاف تھے۔ اگر وہ اپنی مخالفت کو سیاسی وجوہ تک محدود رکھتے تو اور بات ہوتی لیکن ہماری بدقسمتی کہ انھوں نے اس تحریک کی مخالفت میں اس معیار قومیت کی مخالفت شروع کر دی جو اسلام کا اصل الاصول تھا۔ ان مخالفین میں مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) جیسے حضرات پیش پیش تھے جن کے علم و فضیلت کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن آپ اس دور کا لٹریچر اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں آپ کو ان حضرات کی طرف سے اپنے مسلک کی تائید میں پیش کردہ نہ قرآن کی کوئی آیت ملے گی نہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے کوئی مثال۔ مولانا آزاد جب اپنے دورِ الہلال والبلاغ میں دین کی بنیادوں پر خالص مسلم قومیت کے پُرجوش مبلغ تھے تو اس کی تائید میں کتاب و سنت کے حوالوں پر حوالے دیئے چلے جاتے تھے۔ لیکن جب وہ بعد میں متحدہ قومیت کے حامی بن گئے تو ان کے لب پر (ان کی ابوالکلامیت کے باوصف) ایسی مہر سکوت ثبت ہوئی جو ان کے آخری دم تک نہ ٹوٹی۔ مولانا مدنی نے ایک آدھ مرتبہ اس پر گفتگو کی کوشش کی لیکن اس کا جو جواب علامہ اقبالؒ کی طرف سے ملا وہ جریدۂ عالم پر منقوش ہے۔ بہرحال اس تحریک کی (اور اس کے ساتھ اسلام کے معیار قومیت) کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ ان مخالفت کرنے والوں میں کچھ لوگ ان علاقوں کے رہنے والے تھے جو بعد میں پاکستان کی حدود کے اندر آ گئے۔ باقی وہ تھے جو ان حدود سے باہر کے باشندے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ثانی الذکر گروہ میں سے اکثر حضرات پاکستان آ گئے۔
نتیجہ یہ کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں ایسے لوگ کافی تعداد میں جمع ہو گئے جو تحریک پاکستان، اور اس کے ساتھ اسلامی معیار قومیت کے مخالف تھے۔ عام طور پر خیال یہ تھا کہ پاکستان بن جانے (اور ان لوگوں کے ہندوستان سے پاکستان کی طرف آ جانے) کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آ چکی ہو گی۔ لیکن گذشتہ دس گیارہ سال کے تجربہ نے بتایا کہ معیار قومیت کے متعلق ان کے خیالات ابھی تک وہی ہیں، یعنی وہ ابھی تک اسی تصور کے حامل ہیں کہ اسلام میں بھی (دیگر اقوام کی طرح) قومیت کی تشکیل وطن اور نسل کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ آئیڈیلوجی کے اشتراک سے نہیں۔ اور تماشا یہ کہ یہ حضرات اس نظریہ کا مسلسل پراپیگنڈہ کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسے (فکر و آرا کے اظہار کی آزادی کا نام دیکر) اپنا حق سمجھتے ہیں۔ حالانکہ (قطع نظر اس کے کہ یہ چیز اسلام کے ایک اہم اصول کی مخالفت ہے، خود) پاکستان کی تشکیل اسی معیار قومیت کی رہین منت ہے اور پاکستان کے کسی شہری کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس اصول کے خلاف پراپیگنڈہ کرے جو اس مملکت کے لیئے وجہ جواز ہے۔ ان مخالفین میں، سابقہ گروہوں سے متعلق افراد کے علاوہ، وہ لوگ بھی شامل ہیں جو کمیونسٹ ہیں یا کمیونزم کے مؤید۔ ان کی وجہ سے اس مخالفت میں ایک اور شق کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ مصر کا صدر ناصر اور اس کے ہمنوا، مصر کے علاوہ دوسرے عربی ممالک میں بھی پھیلے ہوئے ہیں، کمیونزم کے حامی ہیں۔ اس بنا پر پاکستان کے کمیونسٹوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ شامل ہیں۔ عربی ممالک کا یہ گروہ

نسل کی بنیاد پر عربی قومیت کی تحریک کو آگے بڑھا رہا ہے۔ یہ تحریک اُن پاکستانیوں کے نزدیک بڑی خوش آیند ہے جو اسلامی معیارِ قومیت کے مخالف ہیں (اور جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ، ہر چند یہ تحریک اشتراکِ وطن کے بجائے اشتراکِ نسل پر مبنی ہے لیکن یہ اسلامی معیارِ قومیت کے تو بہر حال خلاف ہے۔ نتیجہ یہ کہ صدر ناصر و شرکائہم کی حمایت، اور دین کی بنیادوں پر تشکیلِ قومیت کے معیار کی مخالفت میں اس گروہ کا اور پاکستانی کمیونسٹوں کا گٹھ جوڑ ہو چکا ہے۔ اور انھوں نے بڑی شد و مد سے اپنے مسلک کی تائید میں پراپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے۔ ان کے اخبارات کو دیکھئے۔ کس کس انداز سے عرب قومیت کی تحریک کو اچھالا اور صدر ناصر کو ہیرو بنایا جا رہا ہے۔ لیکن اس تائید و حمایت میں نہ قرآن کی کسی آیت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ نہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے کوئی مثال پیش کی جاتی ہے۔ (ویسے کس طرح کی جا سکتی ہے جب قرآن اور حضورؐ کا اسوہ دونوں اس تصور کو عہدِ جاہلیت کا باطل تصور قرار دیتے ہوں جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا)۔ ان کی دلیل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ جس نے ان کی مخالفت کی اس کے متعلق جھٹ سے کہہ دیا کہ وہ امریکہ اور برطانیہ کا پٹھو ہے۔ اتنا کہہ دینے کے بعد وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے موقف کو بدلائل و براہین صحیح ثابت کر دیا ہے۔ کمیونزم اور اسلام کے موضوع پر ہم اس سے پہلے کافی تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اس لئے اس وقت ہم اپنے آپ کو صرف وطنی اور نسلی بنیادوں پر قومیت کے نظریہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم ان حضرات سے جو اس تصور کو اس قدر اچھال رہے ہیں، اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ان پر یہ فریضہ عائد نہیں بھی ہوتا کہ وہ اس تصور کے خلاف لب کشائی نہ کریں جس کی بنیاد پر پاکستان کی عمارت قائم ہے۔ تو کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ان پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ایسے تصور کو پھیلانے سے مجتنب رہیں جو اسلام کی اصل و بنیاد کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے؟

اس مقام پر کہہ دیا جائے گا کہ وطن و نسل کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا تصور اسلام کی ایک تعبیر ہے اور آئیڈیلوجی کی بنیادوں پر قومیت کا تصور اس کی دوسری تعبیر۔ ان دونوں تعبیرات میں سے ایک تعبیر کے حامیوں کو کیا حق حاصل ہے کہ اپنی تعبیر کو اسلام کے مطابق اور فریقِ مخالف کی تعبیر کو خلافِ اسلام قرار دیں؟ یہ اعتراض (بنظرِ ظاہر) بڑا وزنی اور یہ ذہنیت (سطحی طور پر دیکھنے سے) بڑی کشادہ نظر آتی ہے۔ لیکن آپ ذرا بہ نگاہِ تعمق دیکھیں کہ اس سے اسلام کی کیا تصویر سامنے آتی ہے۔

اگر ایک کمیونسٹ، کمیونزم کے متعلق ایک بات کہے اور دوسرا اس کے یکسر خلاف دوسری بات تو کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ یہ دونوں (باوجودیکہ متضاد اور ایک دوسرے کے نقیض تصورات) کمیونزم کی دو تعبیریں ہیں۔ وہ کہے گا کہ کمیونزم ایک متعین نظریۂ زندگی اور ایک مخصوص معاشی نظام ہے جس کی متضاد تعبیرات ہو نہیں سکتیں۔ ایسی تعبیرات میں سے ایک ہی تعبیر کمیونزم کے مطابق ہو سکتی ہے اس کے بعد یہ سوال پیدا ہو گا کہ اس امر کا فیصلہ کس طرح سے کیا جائے کہ ان میں سے کونسی تعبیر کمیونزم کے مطابق ہے اور کونسی اس کے خلاف۔ اس کے جواب میں ایک کمیونسٹ بلا تامل کہہ دے گا کہ ہماری فلاں کتاب میں کمیونزم کے اصول و مبانی دیئے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان تعبیرات میں سے کونسی کمیونزم کے مطابق ہے۔

سوال یہ ہے کہ جو طرزِ عمل کمیونزم سے متعلق مختلف تعبیرات کے سلسلہ میں اختیار یا تجویز کیا جاتا ہے، وہی طرزِ عمل

اسلام کے متعلق باہمدگر متضاد تعبیرات کے ضمن میں کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ کیا اسلام میں کوئی ایسی کتاب نہیں جو دو مسلمانوں کے نزدیک اختلافی امور میں یکساں حیثیت سے اتھارٹی بن سکے؟ کیا قرآن کے متعلق تمام مسلمانوں کا یہ ایمان نہیں کہ وہ دین کے معاملات میں سب کے لئے آخری اور حتمی سند ہے؟

اس مقام پر کہہ دیا جاتا ہے کہ قرآن کے متعلق ایسا ایمان تو ضرور ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ دو متضاد تعبیرات تو ایک طرف مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں سے ہر فرقہ اپنی اپنی تعبیر کے متعلق یہ دعوے کرتا ہے کہ اس کی تعبیر قرآن کے مطابق اور فریق مخالف کی تعبیر اس کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ کونسی تعبیر قرآن کے مطابق ہے اور کونسی اس کے خلاف۔

یہ اعتراض بھی بظاہر بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اس سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ بات بالکل واضح ہے۔ یعنی

(i) ہمارا ایمان ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔

(ii) قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

(iii) جس کتاب میں کوئی اختلافی بات نہ ہو، ظاہر ہے کہ اس سے (بہتر تو ایک طرف) دو اختلافی نظریات کو بھی اپنی اپنی تائید نہیں مل سکتی۔

(iv) لیکن اس کے باوجود ہم اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ بے شمار باہمدگر متضاد نظریات میں سے ہر ایک کو قرآن سے تائید مل سکتی ہے۔

سوچئے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم کہہ یہ رہے ہیں کہ مارکس اور لینن کی کتابوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ ان میں سے کمیونزم کے متعلق دو متضاد نظریات کو اپنی اپنی جگہ تائید نہیں مل سکتی۔ وہ ان کے اختلاف کو دور کر دیتی ہیں۔ لیکن جس کتاب کو ہم خدا کا کلام کہتے ہیں اس کی حالت یہ ہے کہ اس میں بیسیوں متضاد نظریات میں سے ہر ایک کو تائید مل جاتی ہے۔ کہیئے کہ کیا قرآن کے متعلق آپ کا یہی خیال ہے؟ اگر یہی خیال ہے تو پھر ذرا جرأت سے کام لے کر بتائیے کہ کیا آپ اس قسم کی کتاب کو خدا کا کلام مانتے ہیں؟ اگر نہیں مانتے تو پھر اس کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ آپ

منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن

کی دو رُخی پالیسی کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں۔

یاد رکھئے کہ قرآن کا یہ دعوے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں ایسی باتیں نہیں جن میں باہمدگر اختلاف ہو حقیقت ثابتہ ہے جو قطب تارے سے زیادہ اٹل اور ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ محکم ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اس کتاب سے، زندگی کے باہمدگر متضاد نظریات میں سے ہر ایک کو تائید مل سکے۔ یہ ناممکن ہے کہ اس میں سے اس نظریہ کو بھی تائید مل جائے

کہ قومیت کا مدار آئیڈیلوجی پر ہے اور اس تصور کو بھی کہ قومیت کا مدار وطن یا نسل کے اشتراک پر ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ جو ایسا سمجھتا ہے۔ وہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے سے عملاً انکار کرتا ہے۔ اس میں سے صرف ایک نظریہ کو تائید حاصل ہو سکتی ہے اور وہ نظریہ یہ ہے کہ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار آئیڈیلوجی (دین) کا اشتراک ہے نہ کہ وطن اور نسل کا اشتراک۔ جن لوگوں نے وطن کی بنیادوں پر قومیت کے نظریہ کو اختیار کیا تھا (اور جو اب بھی اس کی حمایت کرتے ہیں) وہ خالصتہً مغربی نیشنلزم کی تقلید ہے۔ اور جو لوگ نسل کی بنیادوں پر عرب قومیت کے جذبہ کو ابھار رہے ہیں وہ قبل از اسلام، دور جاہلیت کے بتوں کو آوازیں دے رہے ہیں جنہیں نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں نے حریم کعبہ سے نکال باہر کیا تھا۔ صدر ناصر اور ان کے ہم نواؤں کی اس تگ و تاز کا جذبہ محرکہ وہی عصبیت جاہلیہ ہے جسے نہ صرف یہ کہ اسلام سے دور کا واسطہ نہیں بلکہ جو اسلام کی ضد اور نقیض ہے۔ ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ وہ کون سے تاریخی اسباب و محرکات تھے جن کی بنا پر عربوں میں اس عصبیت کے جراثیم بیدار ہوئے۔ اس وقت ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اسباب و محرکات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، ان جراثیم کی اصل وہی زمانہ قبل از اسلام کی عصبیت ہے جسے مٹانے کے بعد، عالم انسانیت کے سب سے بڑے محسن و مربیؐ نے لاکھوں کے مجمع میں اعلان فرمایا تھا

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِیَّةِ تَحْتَ قَدَمِیْ مَوْضُوْعٌ

زمانۂ جاہلیت کے تمام (باطل) آئین و دساتیر میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ (وہ سب پامال ہو چکے ہیں)

پھر اس کی وضاحت میں فرمایا تھا۔

یَا اَیُّهَا النَّاسُ۔ اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَ اِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ۔ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ۔ اِلَّا بِالتَّقْوٰی

اے نوع انساں! سن رکھو کہ تمہارا سب کا رب ایک ہے۔ اور تم تمام ایک ہی اصل کی شاخیں ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر۔ سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

ان باطل تصورات کی بنیادوں کو مسمار کرنے کے بعد انھیں یہ مثبت تصور حیات عطا فرمایا کہ

اِنَّ کُلَّ مُسْلِمٍ اَخُوْ مُسْلِمٍ وَ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ اِخْوَةٌ

(نبی اکرمؐ کا حجۃ الوداع کا خطبہ)

یاد رکھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور اس طرح تمام روئے زمین کے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی۔

یہ ہے مسلم قومیت کا معیار۔ ہم ان حضرات کو جو عربوں کی نسلی قومیت کے حامی ہیں، چیلنج دیتے ہیں کہ وہ اپنے مسلک کی تائید میں قرآن کریم سے ایک آیت پیش کر کے دکھائیں۔ اگر وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں تو طلوع اسلام کے صفحات ان کی نگارشات کے لئے کھلے ہیں۔ فَأْتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ "اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔" فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

آخر میں ہم اس اعتراض کے متعلق بھی دو چار الفاظ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں جو اس ضمن میں بالعموم کیا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جس مملکت (پاکستان) کی بنیاد اس تصور پر رکھی گئی تھی کہ قومیت کا معیار دین کا اشتراک ہے، خود اس کے دستور میں مسلمانوں کی عالمگیر قومیت کے خلاف اور پاکستان کے مسلموں اور غیر مسلموں کی مشترکہ قومیت کے حق میں جرائیم موجود ہیں۔ یہ اعتراض درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام دستور پاکستان کی ان شقوں کو قرآن کے خلاف قرار دے کر انہیں قرآنی تصورات کے مطابق ڈھالنے کی تاکید کرتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن کسی تصور کا، مسلمانوں کی مملکت کے کسی دستور میں موجود ہونا، اسے اسلامی نہیں بنا دیتا۔ اسلامی تصور وہی ہے جس کی تائید قرآن سے ملتی ہو۔ اور قرآن اپنی تعلیم میں ایسا صاف، واضح، ناطق اور متعین ہے کہ اس میں نہ کسی قسم کے شک والتباس کی گنجائش ہے، نہ ابہام اور پیچیدگی کا امکان۔ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

آخر میں ہم پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ جو مسلمان حضرات کمیونزم یا وطن اور نسل کی بنیادوں پر قومیت کے حق میں لب کشائی کریں، ان کے مسلمان کہلانے کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے دعوے کی تائید میں قرآنی اسناد پیش کریں، اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو دیانت اور شرافت کا تقاضا ہے کہ وہ ان دو رستوں میں سے ایک رستہ اپنے لئے اختیار کریں۔ یعنی وہ یا تو ان خلاف اسلام نظریات کی نشر و اشاعت سے باز رہیں۔ اور اگر وہ انہیں صحیح سمجھتے ہیں اور اسلامی نظریۂ قومیت کو غلط، تو وہ اس کا اعلان کر کے، غیر مسلموں کی صف میں جا کھڑے ہوں اور اسی حیثیت سے بات کریں۔ اس امر کی اجازت تو دنیا کی کوئی سوسائٹی بھی نہیں دے سکتی کہ آپ اس کے ممبر بھی رہیں اور سوسائٹی کے اصول و ضوابط کے خلاف پراپیگنڈہ بھی کرتے رہیں۔ ایسی صورت میں خود وہ سوسائٹی آپ کی ممبرشپ (رکنیت) کو کالعدم قرار دے کر آپ کو اپنے حلقہ سے باہر نکال دے گی۔ اگر پاکستان میں اسلام ایک سوسائٹی کی حیثیت سے کارفرما ہوتا (جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں قرآنی معاشرہ قائم ہوتا) تو وہ ایسے لوگوں کے متعلق خود یہ فیصلہ نافذ کر دیتا۔ لیکن اگر یہاں قرآنی معاشرہ قائم نہیں، تو مسلمان کہلانے والوں میں خود اتنی دیانت ہونی چاہیئے کہ وہ یا تو اپنی روش و مسلک کی تائید میں قرآنی سند پیش کریں اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں۔ اور خلاف اسلام نظریات کو صحیح سمجھیں، تو خود اس حلقہ سے الگ ہو جائیں۔ ممکن ہے بعض سطح بین حضرات ہمارے اس مسلک کو تنگ نظری پر محمول کریں۔ لیکن جب آپ دنیا کی ہر سوسائٹی کے سلسلہ میں اس مسلک کو معقول اور حق بجانب قرار دیتے ہیں تو مسلم سوسائٹی کے ضمن میں اسے کیوں تنگ نظری پر محمول تصور کرتے ہیں؟ یاد رکھئے۔ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) اسلام اپنی ہیئت اجتماعیہ کے اصول و مبانی میں کسی قسم کی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور معیار قومیت کا مسئلہ اس کے نزدیک اصولی حیثیت رکھتا ہے خواہ اس کا تعلق عربی ممالک سے ہو یا عجمی سے۔

# مجلسِ اقبال

## مثنوی رموزِ بیخودی

### (در معنیٔ ایں کہ حسنِ سیرتِ ملیہ از تادّب بآدابِ محمدیہ است)

سابقہ عنوان میں حضرت علامہؒ نے بتایا تھا کہ ملت کی سیرت کی پختگی اتباعِ آئینِ الٰہیہ سے ہوتی ہے۔ "آئینِ الٰہیہ" قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ نبی اکرمؐ نے ان پر عمل کر کے انھیں محسوس پیکر عطا فرما دیا۔ لہٰذا امت کے لئے قابلِ تقلید نمونہ نبی کریمؐ کا یہی اسوۂ حسنہ ہے۔ یہ اسوۂ تاریخ وسیر کی کتابوں کے اوراق میں منتشر موتیوں کی طرح ملے گا۔ لیکن چونکہ ان کتابوں میں صحیح اور غلط (ہر قسم کا) سالہ (Material) جمع ہو گیا ہے، اس لئے غلط سے صحیح کو الگ کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے معیار آئینِ الٰہیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ حضورؐ کا اسوہ، انہی آئین کی محسوس تشکل تھی۔ یہی وہ اسوہ ہے جس سے افرادِ ملت میں حسنِ سیرت پیدا ہو سکتا ہے اور اسی سے وہ معاشرہ متشکل ہو سکتا ہے جس میں قوانینِ خداوندی اپنے جیتے جاگتے نتائج مرتب کر سکتے ہیں۔ حضرتِ علامہؒ اس حقیقت کو خود اپنے ایک واقعہ سے اجاگر کرتے ہیں۔ قصے کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

سائلے مثلِ قضائے مبرمے
بر درِ ما زد صدائے پیہمے

ایک دن ایک گداگر (بھیک مانگنے والا فقیر) ہمارے دروازے پر آیا اور (جیسا کہ پیشہ ور بھکاریوں کا شیوہ ہے) اپنی انتہائی اونچی آواز سے صدائیں دینے لگا اور گھر والوں کی سُنے بغیر مسلسل دیتا چلا گیا۔ یہ واقعہ علامہ اقبالؒ کے آغازِ شباب کا ہے۔ انھیں سخت غصہ آیا۔ اور

از غضب چوبے شکستم بر سرش　　　حاصلِ دریوزہ افتاد از برش

وہ انتہائے غضب میں اُٹھے اور فقیر کے سر پر ایک ڈنڈا رسید کر دیا جس سے اس کی جھولی میں جمع شدہ ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

عقل در آغازِ ایامِ شباب
می نیندیشد صواب و ناصواب

یہ آغازِ شباب کا واقعہ ہے جب ہنوز عقل میں اتنی پختگی نہیں پیدا ہوتی کہ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکے۔ اُس زمانے میں عقل، خالص جذبات کے تابع چلتی ہے۔

از مزاجِ من پدر آزردہ گشت
لالہ زارِ چہرہ اش افسردہ گشت

علامہ کے والد بزرگوار نے جب دیکھا کہ بچے کے مزاج میں تحمل اور بُردباری کے بجائے اس قدر غصہ اور تیزی ہے کہ وہ اتنی سی بات پر آپے سے باہر ہو گیا ہے، تو وہ بہت آزردہ خاطر ہوئے۔

بر لبش آہے جگر تابے رسید    در میانِ سینۂ او دل تپید
کوکبے در چشمِ او گردید ریخت    بر سرِ مژگاں دمے تابید ریخت

ان کے سینے میں دل بیقرار ہو گیا۔ شدتِ احساس، ایک آہِ جگر سوز کی شکل میں لبوں تک آ گئی۔ آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور قطراتِ اشک رخسار پر ڈھلک آئے۔

ہمچو آں مرغے کہ در فصلِ خزاں    لرزد از بادِ سحر در آشیاں
در تنم لرزید جانِ غافلم    رفت لیلائے شکیب از محملم

والد کی اس کیفیت کو دیکھ کر علامہ کانپ اُٹھے۔ اپنی غلطی کا احساس بیدار ہوا اور دل سے صبر و شکیب سب جاتا رہا۔

گفت۔ فردا اُمتِ خیر الرسلؐ
جمع گردد پیشِ آں مولائے کل

والد نے کہا کہ بیٹا! ذرا تصور میں لاؤ اُس منظر کو کہ میدانِ حشر میں، ساری اُمت رسول اللہؐ کے گرد جمع ہو گی۔

غازیانِ ملتِ بیضائے او    حافظانِ حکمتِ رعنائے او
ہم شہیدانے کہ دیں را حجت اند    مثلِ انجم در فضائے ملت اند
زاہدان و عاشقانِ دل فگار    عالمان و عاصیانِ شرمسار

اُس مجمع میں اُمت کے جلیل القدر مجاہدین۔ عظیم المرتبت اربابِ علم و بصیرت۔ شہدائے کرام۔ زاہدانِ عبادت گزار۔ عاشقانِ صادق، علمائے دین۔ اور عام گنہگار۔ سب موجود ہوں گے۔

درمیانِ انجمن گردد بلند    نالہ ہائے ایں گدائے دردمند

ایسے وقت میں، اُس مجمع میں اِس فقیر کی دردناک آواز بلند ہوگی۔ سب کی نظریں اُس طرف اٹھ جائیں گی۔

اے صلاحت مشکل از بے مرکبی
من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ

اے بیٹا۔ اے وہ کہ جس نے عقل سے صحیح کام لینا نہیں سیکھا اس لئے وہ خطرات زندگی سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ جس نے سواری میں تجربہ اور پختگی حاصل نہیں کی اس لئے وہ سلامتی کی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔۔۔ اے جانِ پدر! مجھے بتاؤ کہ اُس ہنگامے میں جب نبی اکرمؐ مجھ سے پوچھیں گے کہ

حق جوانے مسلمے با تو سپرد — کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کار آساں ہم نشد — یعنی آں انبارِ گل آدم نشد

"اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان نوجوان کو تیرے سپرد کیا کہ اس کی صحیح تعلیم وتربیت کرو۔ اس نوجوان نے میرے (نبی اکرمؐ کے) مکتب علم وحکمت سے ایک سبق بھی نہ سیکھا۔ تم اس قدر آسان کام کو بھی سرانجام نہ دے سکے۔ تم مٹی کے تودے کو آدم کے پیکر میں تشکل نہ کرسکے۔ تم اس کی صلاحیتوں کو ایسی تربیت نہ دے سکے کہ وہ صفِ آدمیت میں کھڑے ہونے کے قابل ہوسکے"۔

بیٹا! بتاؤ کہ جب نبی اکرمؐ مجھ سے یہ سوال کریں گے تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟ سوچو کہ اس بھرے مجمع میں میری حالت کیا ہوگی؟

در ملامت نرم گفتار آں کریم
من رہینِ خجلت امید و بیم

والد بزرگوار نہایت نرمی سے یہ باتیں کر رہے تھے اور میں شرم کے مارے زمین میں گڑا جارہا تھا۔

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر — اجتماعِ اُمّتِ خیرالبشرؐ
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر — لرزۂ بیم و امیدِ من نگر

انھوں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بیٹا! میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ذرا اُس مجمع امت کو سامنے لاؤ اور پھر بوڑھے باپ کی اس سفید ڈاڑھی کی طرف دیکھو اور سوچو کہ کیا یہ اس قابل ہے کہ اسے اُس محفل میں اس طرح ذلیل ورسوا کیا جائے؟

بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

جانِ من! میں نے تمہارا کوئی ایسا قصور نہیں کیا جس کی پاداش میں تم مجھے اس قدر سخت سزا دے رہے ہو۔ بوڑھے باپ پر اتنی سختی تو نہ کرو۔ تم اس کے لئے دربارِ رسالتؐ میں رسوائی کا موجب تو نہ ہو۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰؐ — گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰؐ

تم گلستانِ مصطفویؐ کی سرسبز و شاداب شاخ کا ایک غنچۂ نورس ہو۔ تمھیں چاہیئے کہ اس صحنِ چمن کی بادِ بہاری کے فیض سے شگفتہ پھول بن جاؤ۔ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں کی تربیت کرو۔

از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرہ از خُلقِ او باید گرفت

تمھیں اُس جنتِ ارضی کی فضائے دل نواز سے اکتسابِ رنگ و بو کرنا چاہیئے۔ تمھیں اخلاقِ محمدیہ کے رنگ میں رنگے جانا چاہیئے۔

مرشدِ رومیؒ چہ خوش فرمودہ است — آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است
مگسل از ختم الرسلؐ ایام خویش — تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش"

دیکھو کہ مولانا رومؒ نے اس حقیقتِ بے پایاں کو کس طرح چند الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے جب کہا ہے کہ "اپنے علم و ہنر اور روش و رفتار پر آزادانہ بھروسہ مت کرو۔ اسوۂ نبی اکرمؐ کو مشعلِ ہدایت بناؤ۔"

فطرتِ مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است

مسلمان کی فطرت یکسر شفقت و محبت ہے۔ اس کی زبان اور ہاتھ اہلِ عالم کے لئے سراپا رحمت ہے۔

[اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان کا شیوہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں جور و ستم ہونے دے اور ظالم کو ظلم اور مجرم کو جرم سے روکے ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مظلوم سے ہمدردی اور شفقت، اہلِ عالم کے لئے رحمت ہے اسی طرح ظالم کی کلائی پکڑ کر اسے عدل و انصاف کی چوکھٹ پر جھکا دینا بھی نوعِ انسانی کے لئے رحمت ہے۔ مسلم ان دونوں صفات کا مرکب ہوتا ہے یہ وہ نکتہ ہے جو علامہ اقبالؒ کے پیغام میں ہر مقام پر ملتا ہے اس لئے اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔]

آنکہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم
رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم

وہ ذاتِ اقدس جس کی اُنگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا اس کی رحمت عام اور اس کا خلق عظیم تھا۔

[علامہ شق القمر کے معجزے کو تقلید عامہ کی رو میں لکھ گئے ہیں ورنہ قرآن کریم سے اس کا (یا حضورؐ کے کسی اور حسی معجزہ کا) ثبوت نہیں ملتا۔ حضورؐ کا معجزہ قرآن اور اس کے مطابق بسر کردہ بلند کردار زندگی تھی۔ ویسے بھی، اس شعر میں "عظیم" کے قافیہ کی رعایت سے "دو نیم" لانا پڑا۔ ورنہ معنوی طور پر یہاں معجزہ شق القمر کے ذکر کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ شاعری میں یہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔]

اس کے بعد علامہ کے والد نے فرمایا۔

از مقامِ او اگر دور ایستی
از میانِ معشرِ ما نیستی

اگر تو اخلاقِ محمدیہ سے دور ہے تو پھر تیرا شمار امتِ محمدیہ میں نہیں ہو سکتا۔

توکہ مرغِ بوستانِ ماستی — ہم صفیر و ہم زبانِ ماستی
نغمہ داری اگر تنہا مزن — جز بہ شاخِ بوستانِ ما مزن

تم ملت کے کُل کے جزو ہو۔ تمہیں اس کل سے الگ ہٹ کر زندگی بسر نہیں کرنی چاہیئے۔ تمہاری تمام صلاحیتیں، سارا سرمایۂ حیات پوری متاعِ زندگی، ملت کے اجتماعی نظام کی تحویل میں رہنی چاہیئے۔ رازِ حیات ملت کی ہم نوائی میں ہے۔

ہرچہ ہست از زندگی سرمایہ دار
میرد اندر عنصرِ ناسازگار

یہ محض جذباتی عقیدت کی وجہ سے نہیں۔ زندگی کا اصول یہ ہے کہ انسانی صلاحیتیں سازگار ماحول میں نہایت عمدگی سے نشو و نما پاتی ہے اور اگر انہیں ناسا عد معاشرہ میں دن گزارنے پڑیں تو وہ مفلوج و مسلول ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بلبل استی در چمن پرواز کن
نغمہ باہم نوایاں ساز کن

اگر تو بلبل ہے تو تیرے لئے سازگار ماحول، باغ و راغ کا ہے۔ تو اُسی ماحول میں اپنے ہم مشرب و ہم مسلک رفقار کی معیت میں زندگی بسر کر۔

در عقاب استی تہہِ دریا مزی
جز بخلوت خانۂ صحرا مزی

اگر تو عقاب ہے تو تیرا نشیمن (مچھلی کی طرح) دریا کے اندر نہیں، صحرا کی بال کشا فضا ہے۔ تجھے اسی کے اندر زندگی گزارنی چاہیئے۔

کوکبی؟ می تاب برگردونِ خویش
پامنہ بیروں ز پیرامونِ خویش

اگر تو ستارہ ہے تو تیرا کام اپنے فلک کو روشن کرنا ہے۔ تجھے اس کے اندر مصروفِ خرام رہنا چاہیئے۔ اس حلقہ سے باہر قدم نہیں نکالنا چاہیئے۔

قطرۂ آبے گر از نیساں بری
در فضائے بوستانش پروری

اگر تو ابرِ نیسانِ بہار سے ایک قطرہ الگ کرے (کہ جسے آغوشِ صدف میں پرورش پا کر گوہرِ تابدار بننا تھا) اور اس کی پرورش فضائے چمن میں شروع کر دے۔

تا مثالِ شبنم از فیضِ بہار — غنچۂ نگش بگیرد در کنار

موسم بہار میں غنچہ اپنا دہن کھولے گا اور (قطرۂ شبنم کی طرح) اس قطرۂ نیساں کو اپنے آغوش میں لے کر بھینچے گا۔

از شعاعِ آسماں تاب سحر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کز فسونش غنچہ می بندد شجر

عنصرِ نم برکشی از جوہرش ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ذوقِ رم از سالماتِ مضطرش

صبح کے وقت سورج کی شعاع آئے گی ـــــ وہ شعاع جس سے غنچے کھل کر پھول ـ پھول نکھر کر زینتِ شاخ اور شاخیں ابھر کر لہلہاتے درخت بن جاتی ہیں۔ اور اس قطرۂ نیساں کو (غالب کے الفاظ میں) "فنا کی تعلیم" دیگی۔[1] اس طرح' تو اس قطرہ سے رطوبتوں کے جوہر خشک کر دے گا۔ اور اس کے اجزائے ترکیبی سے سیمابیت (پارے کی سی تڑپ) کو ختم کرکے رکھ دے گا۔

گوہرت جز جرعۂ آبے ہیچ نیست ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سعیِ تو غیر از سرابے ہیچ نیست

در یم اندازش کہ گردد گوہرے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تابِ او لرزد چو تابِ اخترے

قطرۂ نیساں کہ مہجور از یم است ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ نذرِ خاشاکے مثالِ شبنم است

قطرۂ نیساں کا صحیح مقام سمندر ہے اگر اس کی پرورش وہاں ہو تو وہ ایک دن گوہرِ تابدار بن جائے گا۔ اگر اسے سمندر سے دور رکھا جائے ... ... ... ... ... تو وہ قطرۂ شبنم کی طرح مٹی میں مل کر رہ جائے گا۔ سمندر سے الگ رکھ کر' قطرۂ نیساں کو گوہرِ درخشندہ بنانے کی تمام کوششیں بے سود رہتیں اور رائگاں جاتی ہیں۔ اس طرح قطراتِ نیساں، موتی نہیں بنا کرتے۔

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است

آب و تابش از یمِ پیغمبر است

مسلمان کی نیک فطرت، موتی کی مانند ہے۔ اس کی آب و تاب، سیرتِ نبی اکرمؐ کے بحرِ بے پایاں سے ہم آغوشی ہے۔

آبِ نیسانی! بآغوشش در آ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وز میانِ قلزمش گوہر برآ

در جہاں روشن تر از خورشید شو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ صاحبِ تابانیِ جاوید شو

اگر تو قطرۂ نیساں ہے تو اس سمندر کے آغوش سے ہمکنار ہو جا۔ اور اس طرح اس سے گوہرِ آبدار بن کر نکل۔ ایسا گوہرِ آبدار جو سورج کی طرح روشن ہو اور جس کی تابناکی و درخشندگی میں کمی واقع نہ ہو۔ اسے حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے۔

اس شعر پر اس باب کا خاتمہ ہوتا ہے۔

---

[1] پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک (غالب)

درمعنیٔ ایں کہ حیاتِ ملّیہ مرکزِ محسوس می خواہد و مرکزِ ملّتِ اسلامیہ بیت الحرام است۔

علامہ اقبال اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کسی قوم کی اجتماعی زندگی باقی نہیں رہ سکتی جب تک کوئی محسوس مرکز اُس کا نہ ہو جس سے اس کے افراد وابستہ رہیں۔ مسلمانوں کی آئینی زندگی کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر المومنین (اسلامی نظام) اور مرکزِ محسوس کعبہ ہے۔ اس حقیقت تک پہنچنے سے پہلے علامہ اقبال تمہید میں ایک فلسفیانہ بحث چھیڑتے ہیں جس سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جب بسیط اور مجرد حقائق احوال و ظروف کے پابند ہو جاتے ہیں تو وہ محسوس و مشہود شکل میں سامنے آتے اور کائناتی زندگی میں کار فرما ہوتے ہیں۔ یہی چیز قوموں کی زندگی میں مرکزیت کہلاتی ہے۔ پہلے تمہید ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں۔

من کشایم عقدہ از کارِ حیات
سازمت آگاہ اسرارِ حیات

حیات ( Life ) کس طرح کار فرما ہوتی ہے؟ یہ ایک مشکل اور اہم سوال ہے۔ میں اس عقدہ کو حل کرتا اور اس طرح تمہیں زندگی کے بنیادی راز سے آگاہ کرتا ہوں۔

چوں خیال از خود رمیدن پیشہ اش
از جہت دامن کشیدن پیشہ اش

جس طرح انسانی فکر ( Thought ) کی یہ حالت ہے کہ وہ ہر آن آزادانہ طور پر فضا کی پہنائیوں میں مصروفِ خرام رہتا ہے اور اپنے آپ کو کسی سمت ( Direction ) یا مکان ( space ) کا پابند نہیں بناتا۔ اسی طرح حیات کی کیفیت ہے۔ وہ کاملۃً آزاد ہے اور کسی قید کی پابند نہیں بنائی جا سکتی۔ لیکن اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ

درجہاں دیروز و آید چساں ؟
وقتِ او فردا و دی زاید چساں ؟

جب زندگی اس انداز سے آزاد واقع ہوئی ہے تو پھر وہ زمان ( Time ) کی قید میں کیسے آجاتی ہے؟ وہ امروز و فردا کے پیمانوں میں کیسے ڈھل جاتی ہے۔ وہ عمر کی جریب سے کیسے ماپی جاتی ہے؟ اس کے لئے انسان کو خود اپنے آپ پر نگاہ ڈالنی چاہیئے۔

گر نظر داری یکے بر خود نگر
جز رم پیہم نۂ اے بے خبر

انسانی جسم میں ہر آن تغیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے خلیاتِ حیات ( Life celss ) ہر ثانیہ فنا ہوتے اور نئے بنتے رہتے ہیں۔ لیکن ان مسلسل تغیرات کے باوجود "میں" ( I ) یا آنا غیر متغیر رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حیاتِ آزاد، ان پابندیوں کو

کیسے قبول کر لیتی ہے؟

تانمایدتاب و تابِ شہودِ خویش
شعلۂ او پردہ بندد از دودِ خویش

جب حیات چاہتی ہے کہ اپنی غیر مشہود (مرئی اور محسوس نہ ہونے والی) کیفیات کو ظاہر کرے تو اس کا شعلہ خود اپنے دھوئیں کے پیکر میں محبوس ہو جاتا ہے اور یوں زندگی ایک محسوس قالب اختیار کر لیتی ہے۔ اس حقیقت کو علامہ نے دوسری جگہ ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

اختلاطِ لفظ و معنی ارتباطِ جسم و جاں
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

یوں حیات، مرئی و مشہود ہو جاتی ہے۔

سیرِ او را تا سکوں بیند نظر
موجِ جوشش بستہ آمد در گہر

جب حیات، بسیط شکل میں ہو تو وہ حرکتِ پیہم ہوتی ہے۔ اس خیال سے کہ وہ متحرک سے ساکن نظر آئے، وہ اپنی موج (wave) میں ارتکاز پیدا کرکے، اسے گہر (موتی) کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

آتشِ او دم بخویش اندر کشید
لالہ گردید و ز شاخے بر دمید

حیات، ایک شعلۂ بیباک ہے۔ لیکن جب وہ اپنی اس حرارت کو اپنے سینے کے اندر مقام لیتی ہے تو گل و لالہ کی شکل میں پردۂ شاخ سے باہر آجاتی ہے۔

فکرِ خامِ تو گراں خیز است و لنگ
تہمتِ گل بست بر پروازِ رنگ

جس شے کو تمہاری نگاہیں پھول کی شکل میں دیکھتی ہیں، وہ پیہم اڑنے والے رنگ سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ تمہاری فکر کی ناپختگی اور سست رفتاری ہے جو رنگ کی پرواز کو ساکن پھول کی شکل میں دیکھ کر مطمئن ہو جاتی ہے۔

زندگی مرغِ نشیمن ساز نیست
طائرِ رنگ است جز پرواز نیست

زندگی ایسا پرندہ نہیں جو کہیں گھونسلہ بنا کر رہے۔ وہ مسلسل پرواز میں مصروف رہتی ہے۔

در نفس واماندہ و آزاد ہم　　　　باز نوا ہا می زند فریاد ہم

جب طائرِ حیات پابندِ قفس ہو جاتا ہے تو وہ کمزور اور واماندہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی آزادی کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ وہ قفس کی تنگ زندگی سے گھبراتا ہے اور اس کے خلاف لبِ شکایت کھولتا ہے۔

از پرشں پرواز شوید دمبدم
چارۂ خود کردہ جوید دمبدم

پابندِ قفس رہنے سے اس کے پروں سے طاقتِ پرواز کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ حیات پر یہ پابندی کہیں خارج سے عائد شدہ نہیں ہوتی۔ اس کی خود عائد کردہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی خود پیدا کردہ مشکلات کے حل و ریافت کرتی اور ان پابندیوں سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یعنی

عقدہ ہا خود می زند در کارِ خویش
باز آساں می کند دشوارِ خویش

وہ پہلے خود ہی اپنے ہاتھوں سے گرہیں دیتی ہے اور پھر ان گرہوں کو دانتوں سے کھولتی اور اس طرح اپنی دشواریوں کو آسان کر لیتی ہے۔ یہ عقد و کشود لاحاصل نہیں ہوتا۔ یہ حیات کا بیکار مشغلہ نہیں۔ جس طرح نہر کے راستے میں پتھروں کی ٹھوکر (FALL) سے نہر کی روانی میں تیزی آجاتی ہے، اسی طرح حیات اپنے راستے میں مادی دشواریوں کو اس لئے پیدا کرتی ہے کہ اس سے اس کی رفتار تیز تر ہو جائے۔

پا بگل گردد حیاتِ تیز گام
تا دو بالا گردشش ذوقِ خرام

وہ اپنے آپ کو مادی پابندیوں میں جکڑتی اس لئے ہے کہ کشمکشِ پیہم اور کشاکشِ مسلسل سے اس کی قوتوں میں اضافہ ہوتا جائے۔

سازہا خوابیدہ اندر سوز او
دوش و فردا زادۂ امروز او

اس کی اس تپش و خلش میں ہزاروں ساز خوابیدہ ہوتے ہیں وہ جب اپنے آپ کو "امروز" کے پیکر میں پابند کر لیتی ہے تو اس سے دوش اور فردا وجود میں آجاتے ہیں

دمبدم مشکل گرد آساں گذار
دمبدم نو آفرین و تازہ کار

وہ ہر آن اپنے لئے مشکلات پیدا کرتی رہتی ہے تاکہ تگ و تاز پیہم سے ان مشکلات پر قابو پاتی رہے۔ اس کے لئے وہ نئی نئی ترکیبیں سوچتی اور نت نئے اسباب و یراق پیدا کرتی رہتی ہے۔ حیات کی ندرت کوشیاں اور جدت آفرینیاں اس کی فطرتِ مشکل پسند کی رہینِ منت ہیں۔

گرچہ مثلِ بو سراپالیش رم است
چوں وطن در سینۂ گیرد، دم است

حیات اگرچہ، بو کی طرح، ہر آن اُڑنے والی حقیقت ہے۔ لیکن جب وہ کسی ذی حیات کے سینے میں اپنا نشیمن بنا لیتی ہے تو سانس کی آمد و شد اس کا نام ہو جاتا ہے۔

رشتہ ہائے خویش را بر خود تند
تکمہ گردد۔ گرہ بر خود زند

وہ اپنی ممکنات کے تاگوں کا جال بنتی اور اسے خود اپنے اوپر تن لیتی ہے۔ وہ ان تاگوں کی گرہیں باندھتی جاتی ہے اور اس طرح ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے، جسے تکمہ کہتے ہیں۔ تکمہ دھاگوں کے مجموعے ہی کا نام ہوتا ہے، لیکن اس کی ہستی دھاگوں سے الگ اور صفات ان سے جداگانہ ہوتی ہیں۔

در گرہ، چوں دانہ، دارد برگ و بر
چشم بر خود وا کند گردد شجر

جس طرح بیج میں، ایک تناور درخت مع اپنے پھول۔ پھل اور پتوں کے پنہاں ہوتا ہے۔ حیات اپنی ہر گرہ میں، ہزاروں نئی تخلیقات کی ممکنات پوشیدہ رکھتی ہے۔ اور جب وہ اپنے آپ پر نگاہ ڈالتی ہے تو اس کے یہ تمام مضمرات مشہود بن کر سامنے آجاتے ہیں۔

خلعتے از آب و گل پیدا کند
دست و پا و چشم و دل پیدا کند

وہ اس تودۂ آب و گل (مادی عناصر) سے اپنے لئے ایک نئی خلعت وضع کرتی ہے اور ایک دانا و بینا انسان وجود میں آجاتا ہے۔

خلوت اندر تن گزیند زندگی
انجمن ہا آفریند زندگی

زندگی جب جسم کے خلوت کدہ میں اپنے آپ کو پابند کر لیتی ہے تو اس خلوت سے ہزار انجمنیں وجود کوش ہو جاتی ہیں۔ تخلیق نو کا راز زمان مکان اور احوال و ظروف کی پابندی میں ہے۔ یہی رازِ حیات ہے

یہاں تک علامہ اقبال نے فلسفیانہ تمہید پیش کی ہے۔ اس تشبیب کے بعد وہ گریز کی طرف آتے اور مقصدِ پیشِ نظر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ

ہمچناں آئینِ میلادِ اُمم
زندگی بر مرکزے آید بہم

قوموں کی تخلیق اور نشاۃِ نو کا بھی یہی حال ہے۔ جب ان میں مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے تو قوم کے رگ و پے سے زندگی

کی نمود شروع ہو جاتی ہے۔

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است
خط او در نقطۂ او مضمر است

دائرہ کے لئے مرکز کی وہی اہمیت ہے جو جسم کے لئے جان کی ہے۔ اگر پرکار کا پاؤں مرکزی نقطہ پر محکم و استوار ہے تو دائرہ صحیح شکل میں وجود پذیر ہوگا۔ اگر وہ اس نقطہ سے ذرا بھی ادھر اُدھر ہٹ گیا تو پورے کا پورا دائرہ بگڑ کر رہ جائے گا۔

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

اسی طرح قوم کا ربط و ضبط اور نظم و نسق اس کے ملی مرکز کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کی زندگی کو دوام مرکز ہی کی بدولت نصیب ہو سکتا ہے۔

راز دار و راز ما بیت الحرام
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

ملت اسلامیہ کا مرکز بیت اللہ شریف ہے۔ اس میں ہماری زندگی کا راز مضمر ہے۔ ہماری تپش و خلش اور نشاط و انبساط کا وہی سبب اور موجب وہی ہے۔

چوں نفس در سینہ آو را پروریم
جان شیرین است او ما پیکریم

ہم اپنے سینے میں سانس کی طرح اس کی پرورش کرتے ہیں۔ ہم محض ایک جسم کے مانند ہیں۔ اس جسم میں زندگی کعبہ کی مرکزیت سے ہے۔

اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ کعبہ سے مراد محض اینٹ اور پتھر کا مکان نہیں۔ نہ ہی اس کی آبادی سے مفہوم یہ ہے کہ اینٹ اور پتھر کی جگہ اس میں سونے اور چاندی کی سلیں لگا دی جائیں۔ اور ہر سال اس پر نہایت بیش قیمت ریشمی غلاف چڑھا دیا جائے۔ خانۂ کعبہ اور اس کے یہ تمام تضمنات درحقیقت محسوس نشانات ( Symbols ) ہیں جنہیں قرآن شعائر اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ( Symbol ) اسی انداز کا ہے جس انداز سے تخت و تاج یا دارالخلافہ کی سلطنت کے محسوس نشانات ہوتے ہیں۔ تخت و تاج کی حفاظت سے مراد اس مملکت کی حفاظت اور اس کے دارالخلافہ کی شوکت و سطوت سے مفہوم اس سلطنت کی ثروت و حشمت ہوتا ہے۔ قرآن نے نظام زندگی یہ تجویز کیا تھا کہ پوری کی پوری اُمّت' ایک "ملتِ واحدہ" ہو۔ اس ملت کا ایک ضابطہ' آئین (قرآن) ہو اور ایک ہی مرکز (کعبہ) ہو۔ اُمّت کا ٹکڑوں میں بٹ جانا اور مختلف گروہوں کا اپنے لئے الگ الگ ضابطۂ قوانین اختیار کر لینا۔ اور کعبے کو محض حج کا مقام قرار دیکر ایک "مذہبی فریضہ" (دینی ذمہ داری نہیں بلکہ محض مذہبی رسم) کے طور پر وہاں جمع ہو جانا، کعبہ کی

مرکزیت نہیں کہلا سکتی۔ قرنِ اوّل کے بعد کعبہ ہمارا ملی مرکز رہا ہی نہیں۔ جس طرح صلوٰۃ کے اجتماعات ہمارے ملی اجتماعات نہیں رہے۔ علامہ اقبال جب کعبہ کی مرکزیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس سے مفہوم اس کا ملی مرکز ہونا ہے۔ نہ کہ محض رسوم کی ادائیگی کا مقام۔ اس نقطہ کو پیشِ نظر رکھنے سے مثنوی کے اس حصہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ سکے گا۔

یہی وہ کعبہ ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ

تازہ رُو بستانِ ما از شبنمش
مزرعِ ما آب گیر از زمزمش

ہمارے گلستانِ ملت کی بہار اُسی مرکز کی شبنم کی رہینِ منت ہے۔ ہماری زندگی کی کھیتی اُسی کے آبِ زمزم سے سیراب ہوتی ہے۔

تاب دار از ذرہ ہائش آفتاب
غوطہ زن اندر فضائش آفتاب

اس کی عظمت و درخشندگی کا یہ عالم ہے کہ سورج اس کے ذروں سے کسبِ ضیا کرتا ہے اور اس کی فضا میں غوطہ زن رہتا ہے۔

دعوئے او را دلیل استیم ما
از براہینِ خلیلؑ استیم ما

تعینِ کعبہ سے مقصد یہ تھا کہ اس سے وابستہ رہنے والی اُمت، دنیا میں مرکزی حیثیت اختیار کرے۔ چنانچہ قرآن کریم میں تبدیلیٔ قبلہ سے متعلق آیت کے بعد ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)۔ اور اس طرح ہم نے تمھیں ایک بین الاقوامی امت بنا دیا تاکہ تم تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگراں رہو اور تمھارے اعمال کی نگرانی تمھارا مرکزِ ملت (رسول) کرے۔ یہ ہے کعبہ کا دعوےٰ۔ اور اس دعوے کی دلیل خود اُمتِ مسلمہ کا وجود ہے۔ جب تک یہ صحیح معنوں میں کعبہ سے وابستہ رہی، اسے بین الاقوامی حیثیت حاصل رہی۔ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آئی تھی۔ اور اُمتِ مسلمہ بھی ملتِ ابراہیمی ہے۔ یعنی اسی دین کی حامل جس کے لئے انھوں نے کعبہ کو قبلہ بنایا تھا

درجہاں مارا بلند آوازہ کرد
با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد

کعبہ سے وابستگی نے ہمیں دنیا میں اس مقام بلند پر سرفراز کر دیا۔ اور ہمیں حیاتِ جاوداں عطا کر دی۔

ملتِ بیضا ز طوفش ہم نفس
ہمچو صبح آفتاب اندر نفس

نصب العین کی وحدت ہمیشہ افراد میں وحدت و یگانگت پیدا کر دیتی ہے۔ تمام افرادِ ملت کا ایک مرکز کے گرد گھومنا شہادت ہے

اس امر کی کہ ان کا نصب العین حیات ایک ہے۔ لہٰذا ہماری ملت کی وحدت کعبہ کو نصب العین قرار دینے کا نتیجہ ہے۔ اسی بندھن سے ہماری بکھری ہوئی کرنیں درخشندہ آفتاب بنتی ہیں۔

از حساب او یکے بسیار ہست
پختہ از بند یکے خود دار ہست

تمہاری کثرت میں وحدت اس سے وابستگی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ سر رشتہ ہے جس سے تمہاری خودداری قائم ہے

تو ز پیوند حریمے زندۂ
تا طواف او کنی پایندۂ

تم حرم کے ساتھ متمسک رہنے ہی سے زندہ ہو۔ تمہاری پایندگی اور دوام کا راز اسے نصب العین حیات بنانے میں ہے۔

در جہاں جانِ امم جمعیت است
در نگر سرِ حرم جمعیت است

دنیا میں قوموں کی زندگی ان کی جمعیت سے وابستہ ہوتی ہے۔ تم اگر غور کرو تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ حرم سے مقصود یہی ہے کہ وہ تم میں جمعیت پیدا کرے۔

عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر — از مآلِ اُمتِ موسےٰ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز را ز دست — رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

مسلمانوں کو چاہیئے کہ یہودیوں کی تاریخ سے عبرت حاصل کریں۔ جب اس قوم کی مرکزیت تباہ ہو گئی تو وہ قوم دنیا میں ذلیل و خوار ہو گئی۔ ان کی ملی حیثیت ہی باقی نہ رہی۔

آنکہ بالید اندر آغوشِ رسل — جزو او دانندۂ اسرارِ کل
دہر سیلی بر بنا گوشش کشید — زندگی خوں گشت و از چشمش چکید

وہ قوم جس نے انبیاء کرامؑ کی گود میں پرورش پائی۔ جس کا ایک ایک فرد پوری کی پوری قوم کی کیفیت کا مظہر اور ان کے رازوں سے واقف تھا۔ جب اس نے مرکز کا رشتہ ہاتھ سے چھوڑ دیا تو زمانہ نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور اس قوم کی زندگی آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک پڑی۔

رفت نم از ریشہ ہائے تاکِ او
بید مجنوں ہم نروید خاکِ او

اس کی انگور کی بیلوں سے زندگی کی نمی خشک ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی حالت یہ ہو گئی کہ انگور تو کجا، اس کی مٹی سے بید مجنوں جیسے بے گل و بر درخت بھی پیدا نہ ہوسکے۔

از گلِ غربت زباں گم کردۂ
ہم نواہم آشیاں گم کردۂ

جب یہودی، یروشلم سے ڈھور ڈنگر کی طرح ہانک کر بابل کے قید خانے میں ڈال دیئے گئے اور اس طرح وطن سے بے وطن ہو گئے۔ تو، اور متاعِ حیات تو ایک طرف، ان کی اپنی زبان تک بھی باقی نہ رہی۔ ان کا آشیاں بھی گیا اور مخصوص ترنم بھی ختم ہو گیا۔

شمع مردہ نوحہ خواں پروانہ اش
مشتِ خاکم لرزد از افسانہ اش

ان کی مرکزیت کی شمع گل ہو گئی اور اس شمع کے پروانے (یہودی افراد) اس کے ماتم کے لئے زندہ رہ گئے۔ میں جب اُن کی حالت پر غور کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔

اے ز تیغِ جور گردوں خستہ تن — اے اسیرِ التباسِ وہم و ظن
پیرہن را جامۂ احرام کن — صبح پیدا از غبارِ شام کن

علامہ اب مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم جو دنیا میں اس قدر مظلوم و مقہور ہو تو اس کا سبب یہ ہے کہ تم میں مرکزیت کی اہمیت کا یقین باقی نہیں رہا۔ تمہارے دکھوں کا علاج یہ ہے کہ تم اپنی الگ الگ گروہ بندیوں اور قومیتوں کو چھوڑ کر، سب ایک رنگ میں رنگے جاؤ۔ سب کعبہ کے مرکز سے وابستہ ہو جاؤ۔ اور اس طرح اپنے ظلمت انگیز ماحول سے صبح نور پیدا کرو۔

شبِ آبا غرقِ اندر سجدہ شو
آنچناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو

تم قرنِ اول کے مسلمانوں کی طرح، قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ اور ان کی اطاعت و تسلیم کو زندگی کا مقصود قرار دے لو۔

مسلمِ پیشیں نیازے آفرید
تا بہ نازے عالم آشوبے رسید

ان مسلمانوں نے قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت سے وہ عظمت حاصل کر لی تھی کہ ساری دنیا میں ان کے دبدبہ و جلال سے تہلکہ مچ گیا تھا۔

در رہ حق پا بہ توکب خار خست
گلستاں در گوشۂ دستار بست

وہ خدا کی راہ میں اس طرح چلے کہ راستے کے کانٹوں کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اور اس طرح ان کی کلاہِ آبدار میں، استیاز کا ایک پھول نہیں پورے کا پورا گلستاں آویزاں ہو گیا ——— تمہیں بھی یہی کچھ کرنا چاہیئے۔

اس شعر پر اس باب کا خاتمہ ہو گیا۔

# اِسلام کی سرگذشت

(ڈاکٹر احمد امین مصری مرحوم)

[سلسلۂ کلام یوں چلا آرہا ہے کہ عہدِ بنی امیہ میں ممالکِ اسلامیہ کے کون کون سے شہر علمی مراکز کی حیثیت سے متعارف تھے اور ان میں کس کس قسم کے علوم و فنون کی گرم بازاری تھی۔ سابقہ قسط میں مکہ کے علاوہ بصرہ اور کوفہ کی کیفیات سامنے آچکی ہیں۔ زیرِ نظر باب میں عراق کی ایک اور حرکت (MOVEMENT) کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

قارئین اس سلسلہ سے اس قدر دلچسپی لے رہے ہیں کہ ان کا تقاضا ہے کہ اس سرگذشت کو بالاقساط پیش کرنے کے بجائے، بقایا حصہ کو ایک ہی قسط میں شائع کر دیا جائے تاکہ انہیں زحمتِ کشِ انتظار نہ ہونا پڑے۔ قارئین کا حسنِ تقاضہ درخورِ تحسین ہے لیکن طلوعِ اسلام کی کوتاہ دامنی اسے پورا کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا یہ سلسلہ اقساط ہی میں جاری رہ سکتا ہے، البتہ اس کے بعد، پوری کی پوری کتاب یکجا شائع کر دی جائے گی۔ تاکہ سرگذشت کا یہ حصہ ایک جگہ محفوظ ہو جائے۔

بہ اللہ التوفیق۔] (طلوعِ اسلام)

## سردارانِ قبائل علمی حرکت کا سرچشمہ تھے

عراق میں دینی تحریک کے علاوہ ایک دوسری تحریک بھی تھی جو گویا کہ زمانہ جاہلیت کی حیاتِ عقلیہ کا تسلسل تھا مگر اسلامی رنگ میں رنگا ہوا۔ عرب کے ان قبیلوں کے جو بصرہ اور کوفہ میں سکونت پذیر تھے رئیس ہوتے تھے اور یہ رئیس اسی قسم کے ہوتے تھے جیسے قبیلوں کے رئیس اور سردار زمانہ جاہلیت میں ہوا کرتے تھے کہ لوگ ان کے گرد جمع رہتے اور امن و جنگ میں ان کے اشاروں پر چلتے۔ شاعر ان کے دروازوں پر کھڑے ہو کر مدح سرائی کرتے۔ ان کے مفاخر کی نشر و اشاعت کرتے اور دشمنوں کی ہجو و مذمت کہتے تھے۔ یہ سردار اپنی سرداری اور مروت کا ثبوت انعامات و اکرامات کی صورت میں پیش کرتے تھے۔ مثال کے طور پر احنف بن قیس کو لیجئے جو بصرہ کے بنو تمیم کے سردار تھے۔ اور حکم ابن المنذر

بن الجارود کو جو بصرہ کے قبیلہ عبد القیس کے سردار تھے۔ نیز مالک بن مسمع کو لیجئے جو بصرہ کے قبیلہ بکر کے سردار تھے۔ یا قتیبہ بن مسلم کو لیجئے جو بصرہ کے قبیلہ قیس کے سردار تھے اور محمد بن عمیر بن عطارد بن حاجب ابن زرارہ جو کوفہ کے قبیلہ بنو تمیم کے سردار تھے اور حسان ابن المنذر جو کوفہ کے قبیلہ ضبہ کے سردار تھے اور حجر بن عدی اور محمد ابن الاشعث جو کوفہ وغیرہ کے قبیلہ کندہ کے سردار تھے۔ یہ تمام سردار اور ان جیسے دوسرے لوگ ادبی اور لٹریری سرگرمیوں کا سرچشمہ تھے۔ ان کی وجہ سے ایسے اشعار وجود میں آتے تھے جو جاہلی اشعار سے شباہت رکھتے تھے اور ایسی حکم اور امثال منوہ پذیر ہوتی تھیں جو اکثم ابن صیفی کے امثال سے پوری شباہت رکھتی تھیں۔ اس ادبی حرکت کی شرح و تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن یہ نامناسب نہیں ہوگا کہ ان بڑی شخصیتوں میں سے کسی ایک شخصیت کی قلمی تصویر کھینچ دی جائے تاکہ اس کے نمونہ سے خود زندگی پر اس کے اثرات اور ادب و لٹریچر پر اس کی تاثیرات واضح ہو سکیں۔ ہم یہاں احنف بن قیس کی شخصیت کو نمونہ کے طور پر لے لیتے ہیں۔

## احنف بن قیس سردار بنو تمیم

احنف ـــــ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے ـــــ بصرہ میں قبیلہ بنو تمیم کے سردار تھے۔ اس کی شخصیت اس انداز کی تھی کہ لوگ کہتے ہیں کہ جب وہ غضبناک ہوتا تھا تو اس کے غصہ کی وجہ سے ایک لاکھ تلواریں تڑپ کر باہر آجایا کرتی تھیں یہ جانے بغیر کہ احنف کو کس بات پر غصہ آیا ہے۔ قبیلہ بنو تمیم جنگ میں ہر آن قوم کا ساتھ دینا تھا جسے احنف پسند کرتا ہو۔ احنف جنگ سے ہاتھ روک لیتا تو سب کے ہاتھ ایک دم رک جاتے تھے۔ امیر معاویہ خوب جانتے تھے کہ اس کی قوم میں احنف کا کیا مرتبہ ہے اور وہ کس قسم کا سردار ہے۔ چنانچہ انھوں نے احنف کو اپنا مقرب بنایا اور اس کی بڑی عزت کی۔ اپنے تمام گورنروں کو بھی تاکید کردی تھی کہ وہ ہر بات میں احنف کی دلجوئی کا خیال رکھیں۔ حتیٰ کہ امیر معاویہ ایسے گورنر کو فوراً معزول کر دیتے تھے جس سے احنف ناراض ہو جاتا تھا۔ بسا اوقات امیر معاویہ کو احنف سے بعض جگر خراش جملے بھی سننے پڑتے تھے اور وہ ان کو برداشت کرتے تھے۔ امیر معاویہ نے ایک دن احنف سے کہا۔ احنف! خدا کی قسم صفین کا دن جب بھی یاد آتا ہے تو دل میں ایک قسم کی تنگی محسوس کرنے لگتا ہوں ـــــ کیونکہ جنگ صفین میں احنف ابن قیس حضرت علیؓ کے ساتھ تھے ـــــ احنف نے جواب دیا۔ اے معاویہ۔ خدا کی قسم وہ دل جن سے ہم نے تم سے نفرت کی تھی اب بھی ہمارے سینوں میں ہیں اور وہ تلواریں جن سے ہم نے جنگ کی تھی اب بھی ہمارے نیاموں میں ہیں اگر تم جنگ کے قریب جانا چاہو اور ایک انگل ادھر بڑھو تو ہم ایک بالشت بھر بڑھنے کو تیار ہیں۔ اگر تم جنگ کی طرف چل کر جانا چاہو تو ہم اس کی طرف دوڑ کر جانے کے لئے تیار ہیں" احنف بن قیس کا ایک عجز اکارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کی وجہ سے بصرہ کے بہت سے قبیلوں میں جو ایک دوسرے کے دشمن تھے باہم الفت پیدا ہو گئی تھی۔ بلند حوصلگی میں وہ آپ ہی اپنی مثال تھے۔ سخاوت اور مروّت میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ جب احنف کا انتقال ہوا تو لوگ کہتے ہیں کہ عرب کا سردار مرگیا۔ ایک عورت نے اسے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ اس عورت نے جنازہ پر کہا۔ تو اپنی قوم میں سردار اور خلیفہ کی بارگاہ میں معزز تھا۔ تیری قوم تیری بات کو سنتی اور تیری رائے کی پیروی کرتی تھی۔ اس کے بہت سے اقوال اور پرحکمت باتیں آج بھی لٹریری کتابوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ مثلاً " اس لذت میں کوئی بھلائی نہیں جس کا نتیجہ ندامت ہو" اور " جو تارک الدنیا ہو جائے وہ کبھی فقیر

نہیں ہوتا" اور "اپنے نفس سے خود انتقام لیلو اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا تم سے انتقام لے"۔ اور "صلہ رحمی کے بعد قطع رحمی کتنی بُری چیز ہے" اور "موقع پر خرچ کرو اور دوسروں کے لئے جمع نہ کرو"۔ اور "حاسد آدمی کو کبھی راحت نہیں ملتی اور جھوٹے آدمی میں کبھی مروت نہیں ہوتی" وغیرہ وغیرہ

---

رہ گئی عراق کی فلسفیانہ تحریک تو اس کو ہم وہاں بیان کریں گے جہاں دینی مذاہب پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ چیز عباسی عہد حکومت میں پروان چڑھی چنانچہ کوفہ میں بہت سے فلاسفہ پیدا ہوئے جنھوں نے فلسفہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ نیز بصرہ میں بھی فلاسفہ کی ایک جماعت پیدا ہوئی جو اخوان الصفا کے نام سے متعارف ہے۔

## شام

ملک مالدار زمین سرسبز، پانی بکثرت، اور فضا معتدل ہے۔ یہاں سے بہت سے انبیاء کرام اُٹھے اور انھوں نے اپنے علاقہ میں دینی تعلیمات پھیلائیں۔ پے در پے مختلف تہذیبیں اس علاقہ پر غالب آتی رہیں اور ترکہ میں اپنے علم اور تہذیب کے اثرات چھوڑتی گئیں۔ فنیقی۔ کلدانی، مصری، عبرانی، یونانی اور رومانی سب کی اپنی اپنی تہذیبیں تھیں، اپنا اپنا علمی سرمایہ تھا۔ ان کے علوم اس علاقہ میں پھیلتے رہے۔ خود اہل شام میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے جو ان کے علمی اور فنی اکتشافات میں برابر کے شریک رہے اور پروان چڑھے اور جنھوں نے دنیا کے مشہور علماء سے مقابلے کئے۔ شام میں متعدد شہر تھے جو علم اور حرکت عقلیہ کا مرکز تھے۔ مثلاً صور، انطاکیہ۔ صیدا، بیروت۔ دمشق اور حمص۔ فینقیوں نے انھیں لکھنے کے لئے حروف دیئے۔ عبرانیوں نے الٰہیات کی تعلیمات دیں۔ یونان نے فلسفیانہ مذاہب اور رومیوں نے فقہی نظریات دیئے۔ ان تمام باتوں کے اثرات شامیوں کی عقلیت میں بڑے نمایاں تھے اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ سریانی علماء نے اس علاقہ میں کس قدر علمی حرکت پیدا کر دی تھی۔

عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت ہی سے ان تمام شہروں سے واقف تھے اس علاقہ کی خوشحالی اور سرسبزی کی طمع میں عرب کے لوگ بڑی تیزی سے اس علاقہ کی طرف بڑھے اور دوسری صدی قبل مسیح سے شروع کر کے حمص اور بطرہ کے مقامات پر اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ اس کے بعد پانچویں صدی مسیحی میں غسانیوں کی حکومت قائم ہوئی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مگر یہ لوگ اس ملک کے باشندے بن گئے اور شام کے علاقوں میں پھیل جانے کے بعد انھوں نے مسیحیت کو قبول کر لیا اور وہاں کی تہذیب کو اختیار کر لیا اور ایسی زبان بولنے لگے جو عربی اور آرامی زبانوں کا معجون مرکب تھی۔ یہ اپنے آپ کو شامی ( Syrians ) شمار کرتے تھے۔ یہ جزیرہ عرب سے ناطہ جوڑنے کے بجائے شام سے اپنا ناطہ زیادہ جوڑتے تھے۔

## شام میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت

اسلام نے ان شہروں کو فتح کر کے اپنی زبان اور تعلیمات وہاں پھیلادیں شام کے عربوں نے قریش کی زبان سیکھنی شروع کر دی۔ بلکہ تمام اہل شام نے

---

لہ شام سے ہماری مراد وہ ملک ہے جس میں فلسطین بھی داخل ہے۔ یاقوت حموی کی طرح عرب مصنفین کی یہی اصطلاح ہے۔

از خود اس زبان کو سیکھنا شروع کر دیا اور اپنی زبانوں ——— آرامی یا یونانی ——— کے ساتھ عربی بھی بولنا شروع کر دیا۔ بالکل اسی طرح نصرانیت اور یہودیت کی جگہ اسلام نے لی اور بیشتر شامی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے ایسے لوگ وہاں بھیجے جو اس نئے دین کی ان کو تعلیم دیں کیونکہ تمام ممالک مفتوحہ میں ایسے آدمی بھیجے جاتے تھے اور یہ حضرت عمرؓ کی مقررہ پالیسی تھی۔

بخاری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ "یزید ابن ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ "اہل شام کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو انہیں قرآن اور فقہ کی تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت معاذؓ، حضرت عبادہؓ اور حضرت ابودرداؓ کو روانہ فرمایا۔" یہ حضرات شام میں دینی مدرسہ کے پہلے مؤسس تھے۔ حضرت معاذؓ کے متعلق ان کی علمی سیرت کے بارہ میں آپ پہلے پڑھ چکے ہیں جہاں ہم نے مکہ کے اسکول پر گفتگو کی ہے۔ حضرت معاذؓ نے اپنا آخری زمانہ ایک معلم کی حیثیت سے شام میں گذارا۔ عبادہ ابن الصامتؓ بھی انصاری ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں قرآن حفظ تھا۔ ان کو ابوعبیدہؓ نے حمص کا گورنر بنایا۔ یہ فلسطین کے قاضی بھی رہے۔ اور اللہ کے دین میں بہت بڑے فقیہ شمار کئے جاتے تھے۔ اظہارِ حق میں بڑے سخت تھے۔ امیر معاویہؓ کی بہت سی باتوں پر انھوں نے گرفت اور نکتہ چینی کی جس پر امیر معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ سے ان کی شکایت کی۔ انھوں نے شام ہی میں وفات پائی۔ ابودرداؓ بھی انصاری ہیں۔ یہ بھی صحابہ میں بڑی فضیلت کے مالک اور بڑے فقیہ تھے۔ یہ دمشق میں قاضی تھے۔ اور وہیں انتقال فرمایا۔

یہ تینوں حضرات ملک شام میں پھیل گئے اور لوگوں کو تعلیم دینے لگے۔ اولاً تینوں کے تینوں حمص میں اترے۔ پھر وہاں حضرت عبادہؓ رہ گئے اور باقی دونوں حضرات میں سے حضرت ابودرداؓ دمشق کی طرف چلے گئے اور حضرت معاذؓ فلسطین کی طرف۔ لیکن بعد میں حضرت عبادہؓ بھی فلسطین ہی چلے گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان تینوں کے بعد عبدالرحمٰن ابن غنم کو بھی اسی مقصد سے بھیجا۔ بہرحال ان کی تربیت سے بہت سے بلند مرتبہ تابعین پیدا ہوئے جیسے ابوادریس خولانی، مکحول دمشقی، عمر بن عبدالعزیز، رجاء بن حیوہ اور بالآخر اسی مدرسہ سے اہل شام کے امام عبدالرحمٰن اوزاعی پیدا ہوئے جن کا مرتبہ کسی طرح بھی امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ سے کم نہیں ہے۔

## شام کے امام عبدالرحمٰن اوزاعیؒ

امام اوزاعی بعلبک میں پیدا ہوئے ......... دمشق اور بیروت میں رہے اور "امام اہل شام" کا لقب پایا۔ اہل شام ان کے مذہب کے پیرو تھے۔ ان کا مذہب مغرب اور اندلس میں پھیلا لیکن بالآخر امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے مذاہب نے ان کے مذہب کو شکست دیدی اور وہ جلد ہی فنا ہو گیا۔

دولتِ بنوامیہ کے عہد میں دمشق مرکزِ خلافت تھا۔ لہٰذا یہ فطری چیز تھی کہ اطراف و اکناف کے علماء، دمشق کا رخ کرتے۔ لیکن خلفائے بنوامیہ نے علمی حرکت کی حوصلہ افزائی نہیں کی ——— جس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ——— انھوں نے شعر، خطابت اور فنونِ ادب کی حوصلہ افزائی ضرور کی۔ لہٰذا دوسری علمی تحریکات خود اپنے زورِ دروں سے ابھرتی اور نشوونما پاتی تھیں۔ جن میں سب سے زیادہ اہم دینی تحریک تھی جس کی ترقی کا باعث دینی حوصلہ اور لوگوں کو حرام و حلال کے مسائل معلوم کرنے کی ضرورت تھی۔ خصوصیت کے ساتھ ان پیش آمدہ نئے حوادث کا حکم معلوم کرنے کی ضرورت جو ابتدائے اسلام میں پیش نہیں آتے تھے۔

## شام میں اسلام اور نصرانیت کا ٹکراؤ

شام میں نصاریٰ کی کثرت موجود تھے جو اپنے دین کی حفاظت میں ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ انھوں نے جزیہ اور اپنی زمینوں کا خراج دینا منظور کر لیا تھا۔ بہت سے شامی نصرانی اسلام میں بھی داخل ہو گئے تھے۔ ان دونوں گروہوں میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو نصرانی تہذیب میں پختہ طور پر رنگے ہوئے تھے۔ یہاں گرجوں کے پہلو بہ پہلو مسجدیں قائم تھیں۔ لہٰذا اسلام اور نصرانیت کا ٹکراؤ جلد ہی شروع ہو گیا۔ باہم مناظرے، مباحثے اور مقابلے ہوتے تھے جس کا نمونہ یحییٰ دمشقی نصرانی کی اس تحریر سے معلوم ہو سکتا ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس ٹکراؤ اور تصادم کی وجہ سے قضاء و قدر اور جبر و اختیار جیسے مسائل پر گفتگوئیں شروع ہوئیں اور خدا کی صفات پر بحثوں نے جنم لیا کہ وہ خدا کی ذات کا عین ہیں یا غیر ہیں۔ شاید اسلام میں علم کلام کی یہی پہلی بنیاد ہے۔

---

## مصر

مسلمانوں نے مصر کو فتح کیا تو وہاں یونانی اور رومی تہذیب پھیلی ہوئی تھی۔ اسکندرانیوں کے مدرسہ، ان کے مذہب اور ان کی تعلیمات کے متعلق مختصراً ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ مصر کی فتح مکمل ہو جانے کے بعد جب عربوں نے مصر کی دولت اور سبزی کا حال سنا تو اُن کا اُدھر رخ ہو گیا اور فسطاط میں انھوں نے اپنے قبائل کے ناموں کے مطابق نشان زدگی شروع کر دی اور وہ شہروں اور دیہاتوں میں پھیل گئے اور اُسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ کھیتی باڑی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ بہت سے قبطی بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ عربوں کے نسب مصریوں کے نسب کے ساتھ خلط ملط ہو گئے کیونکہ باہم شادیوں کا رواج پڑ گیا تھا۔

مصر میں عربوں کے داخلے کے بعد ہی سے مملکت اسلامیہ میں مصر جیسا کہ ایک سیاسی مرکز تھا، علمی مرکز بھی بن گیا۔ لیکن یہ علمی حرکت اپنی ابتدا میں فلسفیانہ یا دنیوی حرکت نہیں تھی۔ اس کی حالت وہی تھی جو اس زمانہ میں دوسرے عقلی مراکز کی تھی۔ سب سے بڑی اہمیت دین کی تھی۔ لہٰذا یہ فطری چیز تھی کہ اس عہد میں تمام ممالک میں سب سے زیادہ اہمیت علم دین ہی کو حاصل ہوتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یونانی اور رومی تہاذیب جو مصر و شام اور عراق میں پھیلی ہوئی تھیں وہ فنا ہو گئی تھیں اور ان کے اثرات مٹ گئے تھے۔ ان تہذیبوں کو فتح اسلامی سے دھکا ضرور لگا اور وہ حرکت دینی کے سامنے سپر انداز ہو گئیں۔ لیکن جب طبائع کو اطمینان حاصل ہوا تو یونانی اور رومی تہاذیب نے پھر سر اُبھارنا شروع کر دیا مگر اب وہ اسلامی تعلیمات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی تھیں۔ چنانچہ جو چیزیں اسلام اور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو سکتی تھیں وہ باقی رہ گئیں۔ جو ہم آہنگ نہیں ہو سکتی تھیں وہ فنا ہو گئیں۔ مگر واضح رہے کہ یونانی اور رومی تہاذیب کا یہ اُبھار دولت بنو امیہ کے آخری زمانہ اور دولت عباسیہ کے ابتدائی دور ہی میں ہوا۔

## عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ

جو صحابہؓ مصر میں سکونت پذیر ہوئے وہ سب علماء تھے اور انھوں نے لوگوں کو اسلام کی تعلیم دی۔ یہی صحابہؓ یہاں کے مدرسہ کی بنیاد تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ ہیں۔ یہ عبداللہ، رسول اللہ صلعم کی احادیث کے سب سے زیادہ جامع تھے۔ جو کچھ سنتے تھے اُسے لکھ لیا کرتے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ ابن عمروؓ کے پاس ایک کتاب دیکھی جس کے متعلق میں نے اُن سے دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا

کہ یہ صحیفۂ صادقہ ہے اس میں وہ احادیث درج ہیں جو میں نے رسول اللہ صلعم سے سنی ہیں کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے[1] ساتھ ہی حدیث کے علاوہ ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ ابن حجر نے اصابہ میں بیان کیا ہے کہ آپ تورات پڑھا کرتے تھے۔ ابن سعد نے طبقات میں شریک سے نقل کیا ہے کہ میں نے عبداللہ ابن عمروؓ کو سریانی زبان کی کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے مدینہ، شام اور مصر میں بہت سے صحابہ اور تابعین نے حدیثیں بیان کی ہیں۔ حضرت عبداللہؓ اپنے والد کے ساتھ مصر میں تشریف لائے تھے۔ جبکہ حضرت عمرؓ نے ان کو مصر کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ جب حضرت عمرو بن العاصؓ کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے ان کے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو وہاں کا گورنر بنا دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے بھی کچھ عرصہ تک انھیں وہاں کا گورنر رکھا مگر بعد میں معزول کر دیا۔

آپ حج اور عمرہ کے لئے حجاز آتے۔ وہاں سے شام جاتے اور شام ہوتے ہوئے مصر لوٹ آیا کرتے تھے۔ آپ نے مصر میں مکان بنا لیا تھا۔ آپ وہیں رہے تا آنکہ وہیں عبدالملک بن مروان کی خلافت کے زمانہ میں انتقال ہوا۔ اور ایک قول کے مطابق مصر میں اپنے گھر ہی میں مدفون ہوئے۔ آپ مصری مدرسہ کے مؤسس اور بانی شمار ہوتے ہیں اور یہ بات صحیح بھی ہے۔ بہت سے اہل مصر نے آپ سے اکتساب علم کیا۔ جو حدیثیں آپ روایت کرتے تھے لوگ ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ مقریزی نے حیوہ ابن شریح سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں حسین بن شفی بن مانع اصبحی کے ہاں گیا تو وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ خدا فلاں آدمی کو غارت کرے میں نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ اس کم بخت نے شفی کی دونوں کتابیں جو انھوں نے عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے سنی تھیں مکبر خولہ اور رباب کے درمیان پھینک دیں[2]۔ ان میں سے ایک کتاب کا عنوان تھا "رسول اللہ کے فیصلے اور ارشادات" اور دوسری کتاب کا عنوان تھا۔ "حوادث و واقعات جو قیامت تک ہونے والے ہیں"

مصر کے مدرسہ سے صحابہ کے بعد یزید ابن ابی حبیب بہت مشہور ہوئے ہیں۔ یہ اصل کے اعتبار سے مغربی تھے اور دنقلہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بعض ان صحابہ سے اکتساب علم کیا تھا جو مصر میں سکونت پذیر تھے۔ کندی کا بیان ہے کہ یہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حلال و حرام اور مسائل فقہیہ کے بارہ میں مصر میں علم پھیلایا۔ ان سے پہلے لوگ محض فتن اور ترغیب و ترہیب کی احادیث میں مشغول رہتے تھے۔ یہ ان تین آدمیوں میں سے تیسرے تھے جنھیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مصر میں فتوے دینے کا اختیار دیا تھا۔ ان میں سے دو آدمی مَوالی میں سے تھے اور ایک عربوں میں سے تھا۔ ان میں سے جو شخص عربی النسل تھا اس کا نام جعفر ابن ربیعہ تھا اور وہ دونوں جو مَوالی میں سے تھے۔ یزید ابن ابی حبیب اور عبداللہ ابن ابی جعفر تھے۔ عربوں کو اس پر شکایت پیدا ہوئی اور انھوں نے اعتراض کیا تو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے فرمایا۔ "اگر مَوالی علم کی چوٹیوں پر چڑھتے جاتے ہیں اور تم لوگ نہیں چڑھتے تو میری اس میں کیا خطا ہے؟"[3] اس کے ساتھ ہی یزید فتن اور جنگوں کے بھی عالم تھے۔ خصوصیت کے ساتھ ان حالات و واقعات کے جو فتح مصر سے تعلق رکھتے تھے۔

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۸۹ ج ۲، [2] مقریزی ص ۳۳۳ ج ۲ ابوسعید ابن یونس کہتے ہیں کہ خولہ اور رباب سے مراد وہ دو بڑی کشتیاں ہیں جو کشتیوں کے پل میں لگی ہوئی تھیں اور فسطاط کی جانب کے کنارہ پر تھیں۔ یہ دونوں کشتیاں اتنی بڑی تھیں کہ ان دونوں کے نیچے سے جہاز نکل جایا کرتے تھے۔ [3] ملاحظہ ہو خطط مقریزی ص ۳۳۳ ج ۲ طبع امیری۔

نیز مصر کے گورنروں اور حکام کے متعلق بھی وہ پوری واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ ان ارکان میں سے ایک ہیں جن سے کندی نے اپنی کتاب "ولاۃ مصر و قضاتہا" میں حالات نقل کئے ہیں۔

یزید کے مشہور تلامذہ میں سے عبداللہ ابن لہیعہ اور لیث بن سعد ہیں۔ عبداللہ، عربی الاصل ہیں۔ یہ حضرموت کے باشندے ہیں۔ ۔۔۔۔ حضرموت کے باشندے زیادہ تر مصر میں نہیں تھے ۔۔۔۔ انھوں نے بہت سے تابعین کو دیکھا اور ان سے اکتساب علم کیا۔ وہ جو کچھ سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے۔ اکثر محدثین مثلاً بخاری اور نسائی انھیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔ افسوس ہے کہ مصر میں تاریخ عرب کے اکثر حوادث انہی سے نقل کئے گئے ہیں۔ اور ان واقعات کی روایت میں وہی معتمد ہیں۔ مصر میں تقریباً نو سال تک یہ قاضی بھی رہے۔

## مصر کے امام لیث بن سعد

صحیح ترین قول کے مطابق لیث بن سعد موالی میں سے ہیں۔ ان کی اصل ۔۔۔ ایران میں ۔۔۔ اصفہان سے ہے۔ لیکن راجح یہی ہے کہ ان کی ولادت مصر میں قلقشندہ کے مقام پر ہوئی۔ اکتساب علم کے لئے یہ بہت سے شہروں میں گھومے۔ چنانچہ مکہ۔ بیت المقدس اور بغداد گئے اور تقریباً اُنسٹھ تابعیوں سے ملے اور ان سے حدیثیں بیان کیں۔ مدینہ منورہ میں انھیں امام مالکؒ سے خاص لگاؤ تھا۔ شرعی مسائل کے بارہ میں ان سے مراسلت اور بحث مباحثے کرتے رہتے تھے۔ امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ لیثؒ امام مالکؒ سے زیادہ فقیہ ہیں مگر ان کے شاگردوں نے ان کی فقہ کا حق ادا نہیں کیا۔ اپنی قوم میں ان کی بڑی عزت تھی۔ گورنر اور قاضی تمام اہم معاملات میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ نہایت ثقہ اور قابل اعتماد بزرگ تھے۔ کسی نے ان کے صدق و امانت میں شک نہیں کیا۔ ان کا خاص مسلک تھا جس کے ساتھ وہ مشہور تھے۔ مصریوں نے ان کی تقلید اور پیروی کی لیکن ان کا مذہب بھی اس طرح ضائع ہو گیا جیسا کہ شام میں اوزاعی کا مذہب ضائع ہو گیا۔

مذکورہ بالا تصریحات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مختلف ممالک کی فتح کے بعد صحابہ مختلف شہروں میں پھیل گئے تھے۔ ان صحابہؓ میں وہ علماء بھی تھے جو تعلیم دینے کے لئے وہاں گئے تھے اور یہی صحابہ ان شہروں کے مدارس کی بنیاد تھے۔ ان علمائے صحابہ کی علمی تحقیقیں

## خلاصۂ بحث

مختلف تھیں جن کے اثرات ان کے مدارس میں نمایاں تھے۔ مختلف شہروں میں جو شخصیتیں زیادہ اثر انداز ہوئیں وہ یہ تھیں۔ مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ۔ کوفہ میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ۔ مکہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور مصر میں حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ یہ صحابہ، رسول اللہ صلعم کے تمام ارشادات اور اعمال کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی تمام دینی تعلیمات کے متعلق مکمل واقفیت رکھتے تھے کیونکہ ان میں سے ہر صحابی کا یہ حال تھا کہ ایک وقت میں وہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہا تو دوسرے وقت میں ساتھ نہیں رہا۔ جس وقت وہ آپ کے ساتھ نہیں رہا اس دوران کی معلومات اس کو حاصل نہیں ہو سکیں۔ دوسرے صحابہ کو حاصل ہوئیں۔ لہٰذا ہر صحابی کو کچھ باتیں معلوم تھیں تو کچھ باتیں معلوم نہیں تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کچھ شہروں میں ایسی احادیث پائی جاتی تھیں جو دوسرے شہروں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ ان صحابہ کے جانشین تابعین ہوئے۔ جنھوں نے ان صحابہ سے علم

حاصل کیا اور علم کا جھنڈا بلند رکھنے میں انھوں نے ہی صحابہ کی جگہ لی۔ ان میں سے اکثر کو معلوم تھا کہ دوسرے شہروں میں ایسا علم پایا جاتا ہے جو ان کے شہر میں نہیں ہے۔ اسی لئے انھوں نے زیادہ تر سفر کئے۔ لہٰذا اعصار میں علم کی یہ حرکت برابر قائم رہی۔ ایک مصری مدینہ منورہ کی طرف سفر کرتا تو ایک مدنی کوفہ کی طرف زادِ سفر باندھتا۔ اسی طرح ایک کوفی شام کی طرف اور ایک شامی اِدھر اُدھر کی طرف جاتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں وہ فرق کم ہوتے چلے گئے جو ان صحابہ کی مختلف علمی شخصیتوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ تابعین سے دوسرے طبقہ کے لوگوں نے اکتساب علم کیا اور وہ بھی انہی کے طریقہ پر چلتے گئے۔

اس کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان مختلف شہروں کے مختلف مدارس میں تفصیلی طور پر کیا کچھ پڑھایا جاتا تھا؟ اس زمانہ میں تمام علمی حرکتیں کس محور پر گردش کرتی تھیں؟ کیا علم میں مختلف شہروں کا اپنا بھی کوئی اثر تھا؟ کیا علم، شام اور مصر میں رومی تہذیب سے بھی اثر پذیر ہوا تھا؟ کیا علم عراق میں ایرانی تہذیب سے متاثر ہوا تھا؟ اور کیا حجاز میں وہ عربوں کی سادگی سے اثر پذیر ہوا تھا۔ ان مذاہب دینیہ پر جو اسلام کے بعد ممالک اسلامیہ میں پیدا ہوئے کیا ان دینی عقائد کا بھی کوئی اثر تھا جو اسلام سے پہلے ان ممالک میں پھیلے ہوئے تھے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کو بآسانی حل نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال ہم آئندہ دو ابواب میں انہی سوالات کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

---

ان کتابوں کی فہرست جن سے اس باب کی تدوین میں مدد لی گئی۔


(۱) الطبقات الکبریٰ — ابن سعد
(۲) الاصابہ فی اخبار الصحابہ — ابن حجر
(۳) اسد الغابہ — ابن اثیر
(۴) فتوح البلدان — بلاذری
(۵) معجم البلدان — یاقوت
(۶) کتاب البلدان — ہمدانی المعروف بابن الفقیہ
(۷) التنبیہ والاشراف — مسعودی
(۸) تاریخ ابن جریر — طبری
(۹) شرح نہج البلاغۃ — ابن ابی حدید
(۱۰) دائرۃ المعارف الاسلامیہ — مادۂ عراق۔ بصرہ۔ کوفہ۔ شام۔ مصر وغیرہ۔
(۱۱) ابن خلکان
(۱۲) خطط المقریزی

(۱۳) اخبار ولات مصر و قضاتہا۔ کندی

(۱۴) الاغانی۔ العقد الفرید۔ عیون الاخبار لابن قتیبہ جلد اوّل و دوم۔

(۱۵) اعلام الموقعین ابن القیم

(۱۶) فہرست ابن الندیم

(۱۷) طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ

(۱۸) اخبار الحکماء قفطی

(۱۹) الاعلاق النفیسہ ابن رستہ

ان کے علاوہ دیگر کتب جن کا تذکرہ دورانِ بحث میں کر دیا گیا ہے۔


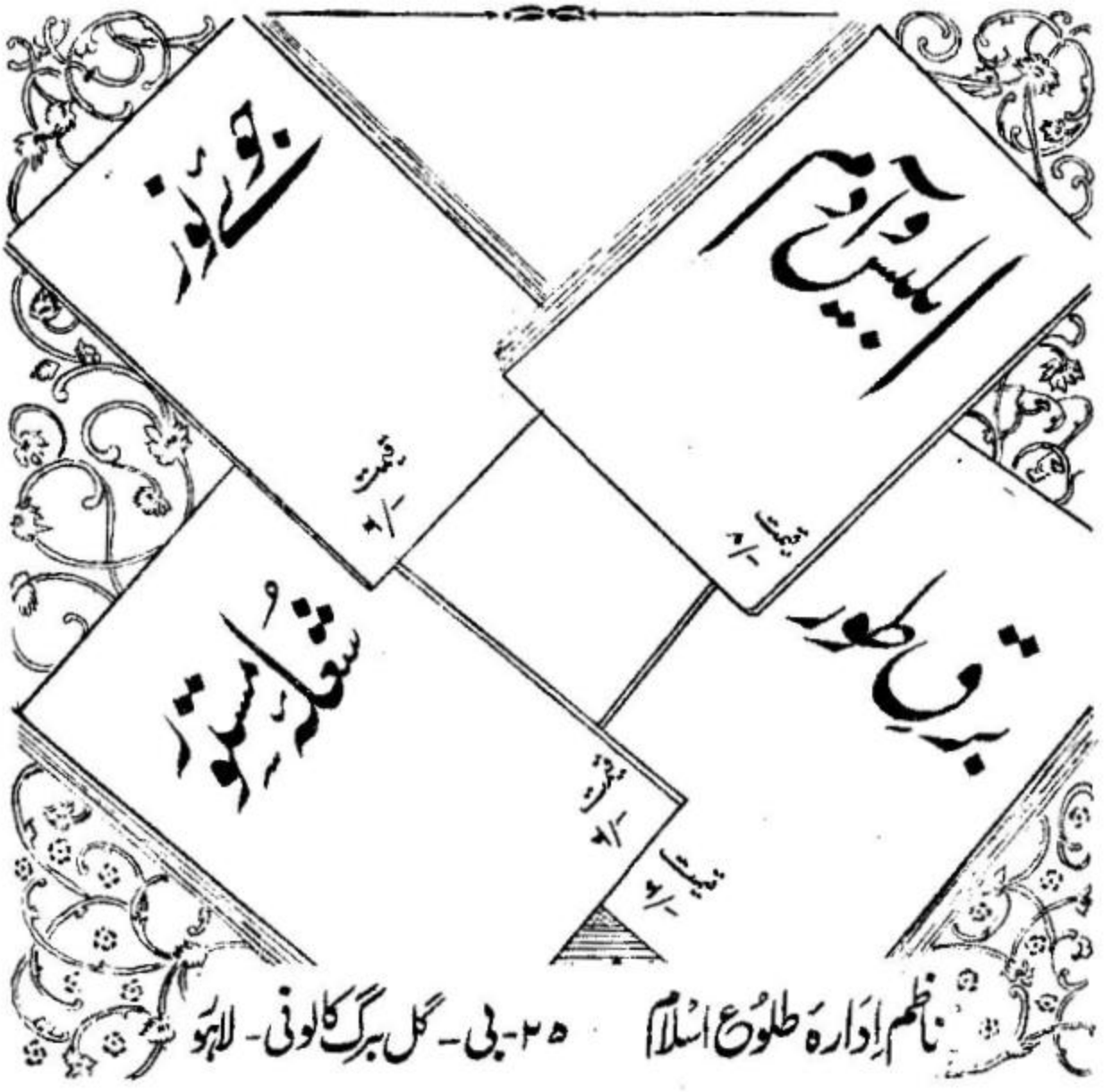

حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ پیشوائیت۔ غرضیکہ ہر نوع کی غلامی اور ہر قسم کے استبداد کے خلاف اعلان جنگ ہوتی تھی۔ وہ باطل کے ان خرمنوں پر برقِ خاطف بن کر گرتی اور انھیں خس و خاشاک بنا کر رکھ دیتی۔ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی لیکن انسانی تحریف نے آپ کو ایک بے تعبیر بے نوا کی حیثیت دیدی جس کی پکار یہ ہو کہ کسی طاغوتی قوت کا مقابلہ مت کرو اور جو رہزن تمہارا کوٹ اتارے اسے اپنی واسکٹ خود اتار کر دیدو۔

محترم پرویز صاحب کی تحقیق نے، قرآن اور تاریخ کی روشنی میں انسانی تحریف کے ان تمام پردوں کو چاک کر کے جناب مسیحؑ کی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ جس میں آپ کی پیدائش۔ ابتدائی زندگی۔ دعوت۔ آپ کے خلاف سازش ہجرت وغیرہ کے واقعات کے علاوہ عیسائیت کے غلط عقائد۔ الوہیت۔ ابنیت۔ کفارہ وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

آخر میں تمام انبیائے سابقہ اور امم گذشتہ کے احوال و ظروف پر ایک بازگشت ڈالی گئی ہے۔

یہ کتاب معارف القرآن جلد سوم کے متعلقہ حصہ کا جدید ایڈیشن ہے جسے مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت قریب پونے تین سو صفحات قیمت مجلد -/6 چھ روپے

ملنے کا پتہ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گل برگ۔ لاہور

# در زمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد اولیٰ تر است

(از سید اللہ بخش صاحب ایم اے ڈیرہ غازیخاں)

ماہ اگست ۱۹۵۸ء کے طلوعِ اسلام میں "مجلسِ اقبال" کے مستقل عنوان کے تحت آپ نے جس طرز سے تقلید آبا کی مذمت اور اس کا رد پیش کیا ہے اس میں آپ نے اس نکتہ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے جس کو اقبال کی حقیقت بیں اور دور رس نگاہیں محسوس کر رہی تھیں۔ بجائے اس کے کہ آپ اس مردِ حق کی ژرف نگاہی، مومنانہ فراست اور دور بینی کے معترف ہوتے آپ نے اس کے اس باب کو "حقیقت کے خلاف" ٹھہرایا اور اس حد تک خواہش ظاہر کی کہ:

"علامہ اقبال کو چاہیئے تھا کہ بعد میں اس حصہ کو خود خارج کر دیتے"۔

اجتہاد کی اہمیت ظاہر ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر اجتہاد کی اہمیت سے کون واقف تھا وہ لکھتے ہیں:

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص زمانہ حال کے جیورس پروڈنس (اصولِ قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا"۔

لیکن آپ نے جو تنقید کی ہے اس میں اعتدال کا رشتہ آپ سے چھوٹ گیا ہے۔ علامہ اقبال جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ خود اس باب کے عنوان سے ظاہر ہے کہ زمانۂ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر اور زیادہ مناسب ہے۔ انحطاط سیاسی غلامی اور محکومی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سیاسی غلامی کا ایک لازمہ ذہنی غلامی ہے۔ غلام قوم اپنی حاکم اور فرمانروا قوم کی ہر بات میں نقالی کرتی ہے۔ فردۃً خاسئین کی زندہ تصویر ہوتی ہے۔ حاکم قوم کے نظریات تصورات اور اعمال کو اپنانا باعثِ فخر سمجھتی ہے اور محکوم قوم کے لیڈر ان غلط نظریات و اعمال کو اپنی قوم میں رواج دینے کے لئے سندِ جواز تلاش کرتے ہیں تاکہ عوام الناس میں وہ نظریات و اعمال مقبول ہو کر رواج پا سکیں۔ یہ وہ مستعار خیالات، نظریات اور اعمال ہوتے ہیں جن میں نہ جدّتِ افکار ہوتی ہے اور نہ جدّتِ کردار۔ اس لذت سے وہ بالکل محروم ہوتے ہیں لیکن ان کو درجہ اجتہاد کا دے دیا جاتا ہے۔ وہ اجتہاد نہیں ہوتا بلکہ گمراہ قوموں کے کافرانہ نظریات اور فاسقانہ اعمال ہوتے ہیں جن کو اجتہا

کا لباس پہنایا جاتا ہے جیسا کہ آج کل کا تجدد پرست طبقہ گمراہ قوموں کے غیر اسلامی افکار و اعمال کو دین میں شامل کرنے کے لئے مضطرب ہے اور اُن کا پیوند اسلامی نظریات و تصورات کے ساتھ لگانا چاہتا ہے اور اپنی اس گمراہ فکر کو اجتہاد کے مقدس لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور زمانے کے جدید تقاضوں کا راگ الاپتا ہے۔

یہ صورتِ حال نہایت خطرناک ہوتی ہے۔ منفعلانہ ذہنیت دوسروں کو متاثر کرنے کی بجائے دوسروں سے خود مرعوب و متاثر ہوتی ہے۔ ہر قسم کے رطب و یابس خیالات وہ قبول کر لیتی ہے جو اُس قوم کی فکری وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس لئے نہ صرف علامہ اقبال نے بلکہ اس دور کے ہر اسلامی مفکر نے یہی علاج تجویز کیا ہے جو کہ متنوی کے زیر بحث باب میں ہے۔ الہلال اور البلاغ کی دعوت یہی تھی۔ چنانچہ اس دعوت سے متاثر ہو کر ظفر علی خاں نے کہا تھا۔

جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوئی
تجھ کو ہے اِس کی جستجو تو پوچھ ابو الکلام سے

(سلف کی راہ کی وضاحت آگے آتی ہے)

ایسے فتنوں کا سدباب کرنے کے لئے اسلام میں اجتہاد کے لئے چند قیود و پابندیاں مقرر کی گئی ہیں۔ کالج کا ہر ڈگری یافتہ اور دیوبند ندوہ کا ہر سند یافتہ یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ مجتہد بن بیٹھے اس کے لئے علم و نظر کی وسعت، فکری صلاحیت، بلند و مضبوط کردار و سیرت، دین کے اصول و احکام اور اُن کی حقیقی روح سے واقفیت ضروری ہے۔ آخری جزو سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر علم کی وسعت اور فکری صلاحیت بے سود ہے۔ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کا رشتہ اُس اساس و بنیاد سے منقطع نہ ہونے پائے جس پر یہ قوانین و ضوابط مبنی ہوں۔ اصل و اساس اور فروع و تفصیلات کے مابین ایک گہرا معنوی ربط اور حقیقی موافقت ہو۔ ایسا اجتہاد جو قرآن اور اسلام کی روح اور اُن کے بنیادی اصول و احکامات سے لگا نہ کھاتا ہو تحریفِ دین اور خواہشاتِ نفسانی و شیطانی کا اتباع ہے۔

نیز آپ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو استدلال قرآنی آیت سے کیا ہے وہ مبنی بر مغالطہ (Fallacious) ہے آپ نے تحریر کیا ہے۔

"یہودیوں کی جمعیت ان کی نسل پرستی کی وجہ سے قائم رہی۔ ورنہ جہاں تک آبا کے راستے پر چلنے کا تعلق ہے قرآن نے ان کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی ہے اُس میں اس روش کو سرفہرست رکھا ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (۳۱/۲۱) جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اُس کی اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم اُس روش پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آبا کو پایا ہے۔ تقلید قرآن کی رُو سے بدترین جُرم ہے۔"

سورۂ لقمان کی جس آیت کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ بالکل اسی مضمون اور تقریباً انہی الفاظ کی آیت سورۂ بقرہ میں اس طرح آئی ہے۔ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا۔ اس کے

مَّا بعد فرمایا اَوَ لَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّ لَا یَھْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰) جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا اُس کا اتباع کرو وہ کہتے ہیں نہیں ہم اس روش پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آبار کو پایا۔

اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں خواہ اُن کے آبار نہ کچھ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہی ہدایت یافتہ ہوں۔ کیا پھر بھی انہی کا اتباع کرو گے۔

قرآن مجید نے جس امر کی مذمت کی ہے وہ نفس تقلید نہیں بلکہ جاہل (لَا یَعْقِلُوْنَ) اور گمراہ (لَا یَھْتَدُوْنَ) آبار کی تقلید ہے ورنہ اَوَ لَوْ کَانَ سے لے کر لَا یَھْتَدُوْنَ تک تمام جملہ بے ربط اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ جس امر سے روکا گیا ہے وہ ایسے آبار کی تقلید ہے جو لَا یَعْقِلُوْن اور لَا یَھْتَدُوْن ہوں۔ چنانچہ اس رکوع میں پیشوایانِ باطل کی تقلید سے روکا گیا ہے۔ اس آیت سے ماقبل آیات کا بھی یہی موضوع ہے۔ برعکس اس کے اگر آبار یَعْقِلُوْن اور یَھْتَدُوْن ہوں تو اُن کے اتباع سے نہیں روکا گیا کیونکہ وہ خود عقل و ہدایت کی پیروی کرتے ہیں۔ انبیائے کرام جن کے متعلق ہمیں حکم دیا ہے کہ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ کہ اُن کی ہدایت کی پیروی کرو اُن کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں بوقت دم واپسیں اپنے بیٹوں سے دریافت فرماتے ہیں مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے۔ بیٹے جواب دیتے ہیں نَعْبُدُ اِلٰھَکَ وَ اِلٰہَ اٰبَآئِکَ (۲/۱۳۳) ہم آپ کے خدا اور آپ کے آباء کے خدا کی عبادت کریں گے۔ وہ آباء کے لفظ پر معترض نہیں ہوتے بلکہ قرآن نے جس طرز سے اس واقعہ کا بیان فرمایا ہے اُسے سراہا ہے۔

اب ذرا آگے بڑھیئے!

حضرت یوسف علیہ السلام زنداں کی چار دیواری کے اندر جس بے مثال و بے نظیر طریقہ سے توحید کی دعوت پیش کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُس تقریر میں یہ بھی فرماتے ہیں:

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیْ (۱۲/۳۸)

میں اپنے آبار کا اتباع کرتا ہوں۔

اب اگر تقلید آبار قرآن کے نزدیک بدترین جُرم ہوتی تو حضرت یوسف علیہ السلام یہ الفاظ ہرگز استعمال نہ فرماتے۔ اصل میں حقیقت وہی ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ نفسِ تقلید مذموم نہیں۔ جو چیز مذموم ہے وہ ایسے آبار کا اتباع ہے جو لَا یَعْقِلُوْن اور لَا یَھْتَدُوْن ہوں نہ کہ اُن آبار کا اتباع جو یَعْقِلُوْن اور یَھْتَدُوْن ہوں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام تھے جن کا ذکر انھوں نے اسی آیت میں نام لے کر کیا (۱۲/۳۸)

پھر سورۂ حج کی آخری آیت ملاحظہ ہو۔ اگر محض تقلید آبار ہی قابلِ نفرت چیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کے لئے ایک راستہ متعین فرماتے ہیں تو ایسے لفظ کے استعمال سے احتراز فرماتے جو کسی وقت بھی گمراہی کا باعث بن سکتا ہو۔ جہاں فرمایا ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اُس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ اُس سے قبل فرمایا مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ۔ تمام طریقہ دینی

ہے جو تمہارے "اَبْ" ابراہیمؑ کا تھا۔ ملت ابراہیم کہہ دینا بھی مفہوم ادا کرنے کے لئے کافی تھا تو ایک ایسے لفظ کا اضافہ نہ فرمایا ہوتا جس کے استعمال ہی سے گمراہی میں مبتلا ہو جانے کا اشتباہ یا امکان موجود ہو۔

باقی رہا ہر دور کے مسلمانوں کا اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل خود تلاش کرنا تو اس سلسلے میں بھی انسانی عقل کو بالکل آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے اوپر بھی پابندیاں ہیں جن کا ذکر میں شروع میں اجتہاد کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ اسلامی زندگی کی حقیقت باقی رکھنا ہے تو قرآن و اسلام کے مرکز سے وابستہ رہنا ہوگا اور اصولِ اجتہاد کے ساتھ اصولِ استناد کو ترتیب دینا ہوگا۔

اس نظام کی مثال تناور درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں انتہائی مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں کہ اسے انقلاب حوادث کا کوئی طوفان اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور جس کی ٹہنیوں اور شاخوں میں لچک ہو کہ تیز و تند آندھیوں سے اِدھر اُدھر ملتی رہیں اور ٹوٹنے نہ پائیں اور جس کے پتے گرتے اور پھر نکل آتے ہوں۔ اس درخت کی حفاظت جس طرح جڑوں کی مضبوطی پر موقوف ہے اسی طرح شاخوں کی لچک اور پتوں کے گرنے اور پھر نکلنے پر بھی منحصر ہے جو لوگ اس کی جڑوں کو کاٹتے ہیں وہ اس کے دشمن ہیں، جو اس کی شاخوں کی لچک کو برباد کرنا چاہتے ہیں وہ اُن کے نادان دوست ہیں۔ علامہ اقبال مسلمانوں سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ اگر کسی تناور درخت کی شاخوں کی لچک قائم نہ رہی ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس درخت کی جڑ پر کلہاڑا چلا دیں کیونکہ اگر جڑ قائم رہی تو امید ہو سکتی ہے کہ نئی لچک دار شاخیں نکل آئیں کونپلیں پھوٹ پڑیں نئے سرسبز پتے بھی نمودار ہو جائیں۔ لیکن اگر جڑ ہی کو کاٹ دیا تو پھر لچک دار شاخوں اور نئے سرسبز پتوں کے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ آپ نے بھی اپنے مضمون کے آخیر جا کر دبی زبان سے نہایت مبہم طریقہ پر اس امر کا اعتراف کیا ہے "کہ جو کچھ علامہ کہنا چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ تم اپنے زوال سے گھبرا کر یورپ کی مادہ پرستی کا راستہ اختیار نہ کر لینا۔ ملت سے وابستہ رہنا اور قرآن کی طرف رجعت کی کوشش کرنا" لیکن یہ ایک سطر سات صفحات پر مشتمل فکر سے پیدا شدہ اثرات کی شدت کو کم نہیں کر سکتی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ انتہا پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرنے کی بجائے اعتدال و توسط کی راہ اختیار کی جاتی تاکہ قارئین کے سامنے مسئلہ کی پوری وضاحت ہو جاتی۔

---

## طلوعِ اسلام

محترم اللہ بخش صاحب کی مندرجہ صدر تنقید موصول ہونے پر ہم نے اپنی ان تصریحات کو ایک بار پھر پڑھا جو اگست ۱۹۵۸ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ جو باتیں اس تنقید میں کہی گئی ہیں کم و بیش ان سب کا جواب ہماری تصریحات میں موجود ہے۔ بایں ہمہ، ہم اس تنقید کو شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ تقلید آباء کے حق میں بالعموم کیا کہا جاتا ہے۔ اس تنقید میں چند مغالطے ہیں جن کے متعلق ہم مختصر الفاظ میں اپنی توضیحات پیش کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ محترم تنقید نگار فرماتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اقبال کے مسلک اور خیالات کے خلاف ہے اس ضمن میں عرض ہے کہ (جیسا کہ ہم اگست کے شمارہ میں وضاحت سے لکھ چکے ہیں) علامہ اقبال نے یہ مثنوی ۱۹۱۲-۱۳ء میں لکھی اس کے بعد انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اپنے مشہور (چھ) لیکچر مرتب فرمائے۔ ان لیکچروں میں انھوں نے بڑی وضاحت سے کہا کہ زوالِ بغداد کے بعد

ہمارے علماء نے جو فتویٰ دیا کہ انحطاط کے زمانے میں تقلید پر اکتفا کرنا چاہیئے اور اجتہاد کے دروازے بند کر دینے چاہئیں تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اور اسلام کی روح کے یکسر خلاف" حضرت علامہ کی ان تصریحات کے بعد یہ کہنا کہ ان کا مسلک یہی تھا کہ زمانۂ انحطاط میں اجتہاد جائز نہیں" مدعی سست اور گواہ چست" کی بین مثال ہے۔

(۲) لیکن قطع نظر اس کے کہ علامہ نے پہلے کیا کہا تھا اور بعد میں کیا فرمایا۔ اگر اس سوال پر آزادانہ غور کیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ تاریخ اور فلسفۂ سیاست کا طالب علم جانتا ہے کہ قوموں کا انحطاط ایک دن میں پیدا نہیں ہو جایا کرتا۔ یہ مجموعی نتیجہ (Accumulative Effect) ہوتا ہے سابقہ نسلوں کی غلط روش کا جو بتدریج آگے بڑھتا ہوا بالآخر ان کے سقوط کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے۔ سطحی نگاہیں ان کے اس آخری سقوط کو ان کا انحطاط سمجھتی ہیں۔ لیکن حقیقت شناس نظریں جانتی ہیں کہ یہ انحطاط صدیوں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ کسی قوم سے یہ کہنا کہ تم اپنے زمانۂ زوال میں اُسی روش پر چلتے رہنا جس پر تمہارے آباء (سابقہ نسلیں) چل رہی تھیں، بالفاظِ دیگر اُن سے یہ کہنا ہے کہ تم اس روش کو ہرگز نہ چھوڑنا جس کی وجہ سے تم قعرِ مذلت میں گرے ہو۔ تم اس روشِ کہن کو چھوڑ کر کسی نئے راستے کے اختیار کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہ لانا۔ یہ بہت بُری بات ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم نے اگست کی اشاعت میں کھلے الفاظ میں لکھا تھا۔ اور جس کی تصریح علامہ اقبال نے ۱۹۲۸ء میں کی تھی) انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کی ضرورت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ "زوال کے زمانے میں تقلید اُس زوال پر مہرِ تقدیس ثبت کر دیتی ہے، اور اس کے بعد اس سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ زوال سے نکلنے کا طریق یہ ہے کہ ذہنی اور فکری جمود کو توڑا جائے۔ زندگی کے حقائق کا مردانہ وار سامنا کیا جائے۔ اور اپنے زمانے کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے قرآن کی روشنی میں سابقہ قوانین میں ضروری تبدیلی کی جائے۔ اس کا نام اجتہاد ہے۔" (طلوع اسلام اگست ۱۹۵۵ء)

(۳) محترم اللہ بخش صاحب فرماتے ہیں کہ "انحطاط سیاسی غلامی اور محکومی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سیاسی غلامی کا ایک لازمہ ذہنی غلامی ہے۔ غلام قوم اپنی حاکم اور فرمانروا قوم کی ہر بات میں نقالی کرتی ہے اور قرونِ خاسئین کی زندہ تصویر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس ذہنیت رکھنے والی قوم کو اجتہاد کا درجہ دیدینا کسی طرح جائز نہیں قرار پا سکتا۔

پہلے تو یہ کلیہ غلط ہے کہ "انحطاط سیاسی غلامی اور محکومی کا نتیجہ ہوتا ہے" مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بڑا انحطاط، زوالِ بغداد ہے۔ یہ زوال کسی سیاسی محکومی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بغداد کی عباسی سلطنت پر کوئی دوسری قوم حکمران نہیں ہو گئی تھی۔ وہ کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں تھے۔ ان کا زوال، زندگی بخش قوانین و ضوابط سے انحراف کا نتیجہ تھا۔ بہرحال، یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ جہاں تک موضوعِ پیشِ نظر کا تعلق ہے، تنقید نگار صاحب کا کہنا یہ ہے کہ انحطاط کے زمانے میں قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ وہ حاکم قوم کی نقال بن کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا انھیں اجتہاد کا درجہ کبھی نہیں دینا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس قوم پر ایک دفعہ زوال آجائے اس کی بازآفرینی کی صورت باقی نہیں رہتی۔

اس لئے کہ اس تحیر و ذلت سے نکلنے کے لئے بہر کیف سمجھنے سوچنے کی ضرورت ہو گی۔ اور سمجھنے سوچنے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اس لئے انہیں اپنی حیات نو سے یکسر نا امید ہو جانا چاہیئے۔ یہ تصور جس قدر ضلالت آمیز اور تباہ کن ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

یہ درست ہے کہ انحطاط پذیر قوم میں بالعموم سمجھنے سوچنے کی صلاحیت کا فقدان ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ زوال آتا ہی اس قوم پر ہے جو عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ کر، تقلید کو شیوۂ زندگی بنا لے۔ اور تقلید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں کم ہوتی چلی جائیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انحطاط پذیر قوم میں ایسے افراد باقی نہیں رہتے اور پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ جن میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہو اور جو قوم کی فکری صلاحیتوں کو بیدار کر سکیں۔ اس کی زندہ مثال خود علامہ اقبالؒ ہیں جو ہمارے انتہائی انحطاط اور محکومی کے زمانے کی پیداوار ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف خود علامہ اقبالؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

> زوال آور عناصر کی روک تھام کا مؤثر طریقہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ قوم میں بجود خزیدہ افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے معیار زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ ہم اس میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ (خطبات اقبال)

اس قسم کے افراد کا اُس قوم میں پیدا ہونا نسبتاً آسان ہے جس کے پاس یہ "معیار زیست" محفوظ اور محکم شکل میں موجود ہوں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ معیار قرآن سے زیادہ مکمل، محفوظ اور محکم شکل میں اور کہاں مل سکتے ہیں؟

(۴) محترم اللہ بخش صاحب فرماتے ہیں کہ "ایسے فتنوں کا سد باب کرنے کے لئے اسلام میں اجتہاد کے لئے چند قیود و پابندیاں عائد کی گئی ہیں"۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک انحطاط کے زمانہ میں اجتہاد کا امکان اور ضرورت ہوتی ہے۔ (وہو المراد)۔ البتہ اجتہاد کے لئے کچھ قیود اور پابندیاں عائد کی گئی ہیں"۔ ہم ان سے اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ کون کہتا ہے کہ اجتہاد کے لئے کسی قید اور پابندی کی ضرورت نہیں؟ کیا طلوع اسلام کی یہ تصریح ان کی نظروں سے نہیں گذری کہ

> اس میں شبہ نہیں کہ اجتہاد کے لئے علم و نظر اور فکر و بصیرت اولین شرط ہے۔ لیکن اجتہاد کے لئے اہلیت کی شرط عائد کرنا اور بات ہے اور اجتہاد کا دروازہ بند کر کے تقلید کو نجات کی راہ سمجھ لینا اور بات۔
>
> (طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۵۸ء)

آپ فرماتے ہیں کہ

> ایسا اجتہاد جو قرآن و اسلام کی روح اور ان کے بنیادی اصول و احکامات سے لگانہ کھاتا ہو تحریف دین ہے اور خواہشاتِ نفسانی و شیطانی کا اتباع ہے۔

یہ بعینہٖ وہ مسلک ہے جس کی طرف طلوع اسلام ۱۹۳۸ء سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہے اور جس کی پاداش میں اس کے متعلق نہ جانے کیا کچھ کہا جاتا ہے۔ ضمناً اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ "قرآن و اسلام" دو الگ الگ عناصر نہیں۔ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام اسلام ہے۔

(۵) آپ فرماتے ہیں کہ "قرآن نے جس امر کی مذمت کی ہے وہ نفس تقلید نہیں بلکہ جاہل (لَا یَعْقِلُوْنَ) اور گمراہ (لَا یَهْتَدُوْنَ) آبار کی تقلید ہے"۔ سوال یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کون کرے گا کہ ان آبار میں سے کون "لَا یَعْقِلُوْنَ اور لَا یَهْتَدُوْنَ" کے زمرے میں آتے ہیں اور کون ان سے مستثنیٰ ہیں؟ آپ مسلمانوں کے موجودہ فرقوں میں سے کسی فرقے کو لے لیجئے۔ کوئی فرقہ ایسا نہیں ملے گا جو اپنے آبار (اسلاف) کے متعلق یہ کہے کہ وہ جاہل اور گمراہ تھے۔ حتیٰ کہ بھنگڑ خانے کے بدمستوں سے پوچھئے تو وہ بھی اپنے آبار کو سب سے زیادہ باہوش اور ہدایت یافتہ قرار دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ جب اخلاف میں سے کوئی بھی اپنے اسلاف کو لَا یَعْقِلُوْنَ اور لَا یَهْتَدُوْنَ کی صف میں شمار کرنے پر تیار نہیں تو پھر وہ کون سے آبار ہیں جن کی تقلید سے خدا نے منع کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ایک فرقہ کے معتقد دوسرے فرقہ والوں کے آبار و اجداد (اسلاف) کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ صحیح روش پر نہیں تھے۔ لیکن کسی فرقہ کو اس کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کو تو صاحب عقل و ہدایت سمجھے اور دوسرے فرقہ کے اسلاف کو لَا یَعْقِلُوْنَ اور لَا یَهْتَدُوْنَ کے زمرے میں شمار کرے؟ یہی تو وہ مناقشت ہے جس کا فیصلہ ہزار برس سے نہیں ہو سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے جب یہ کہا ہے کہ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (۳۱/۲۱) تو اس نے دو ایسی روشوں کا مقابلہ کیا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک روش ہے "اتباع ما انزل اللہ" (جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کا اتباع)، اور دوسری روش ہے اتباع آبار (اسلاف کی تقلید)۔ "اتباع ما انزل اللہ" قرآن کی دعوت ہے اور اتباع آبار اس دعوت سے انکار کرنے والوں کی روش۔ لہٰذا یہ دونوں متضاد روشیں ایک جگہ اکٹھی ہو نہیں سکتیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے جو یہ کہا ہے کہ لَا یَعْقِلُوْنَ اور لَا یَهْتَدُوْنَ آبار کا اتباع نہ کرو، تو اس کے کیا معنی ہوئے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کی رُو سے عقل و ہدایت والے وہی ہیں جو قرآن کا اتباع کرتے ہیں۔ جو قرآن کا اتباع نہیں کرتے وہ لَا یَعْقِلُوْنَ اور لَا یَهْتَدُوْنَ کے زمرے میں شامل ہیں۔

اب آپ یہ کہیں گے کہ ہمارے جو آبار، قرآن کا اتباع کرتے تھے ان کی روش پر چلنا تو جائز ہوگا؟

جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہوگا۔ لیکن یہ اتباع آبار کا نہیں ہوگا بلکہ خود قرآن کا اتباع ہوگا۔ مثلاً قرآن کا حکم ہے کہ تم عدل و احسان کرو۔ ہمارے اسلاف میں ایسے لوگ یقیناً ملیں گے جو عدل و احسان سے کام لیتے تھے۔ اب اگر ہم بھی عدل و احسان سے کام لیتے ہیں تو یہ ہمارے ان اسلاف کا اتباع نہیں بلکہ خود قرآن کا اتباع ہے۔ وہ بھی قرآن کا اتباع کرتے تھے ہم بھی قرآن کا اتباع کرتے ہیں۔ لہٰذا اتباع ما انزل اللہ ہی کا کیا جائے گا۔ ہمارے لئے راہ صواب یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے اسلاف سے ہم تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے ہم اسے قرآن کے معیار پر پرکھ کر دیکھیں۔ جو اس معیار پر پورا اترے اسے صحیح قرار دیں۔ جو اس کے خلاف ہو اسے غلط کہیں اس کے بعد صحیح روش پر چلیں اور غلط روش سے اجتناب برتیں۔ یہ ہے اس باب میں قرآن کی تعلیم جس کی طرف طلوع اسلام دعوت دیتا چلا آرہا ہے۔

(۶) آپ فرماتے ہیں کہ دیکھئے حضرت یعقوبؑ کے بیٹے اپنے آبا کے دین پر چلنے کا اقرار کرتے ہیں اور حضرت یعقوبؑ (بلکہ اللہ تعالیٰ) ان کی اس روش کو سراہتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ عربوں (بلکہ تمام مسلمانوں) سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے باپ ابراہیمؑ کا دین اختیار کریں۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن تقلید آبا کی تاکید کرتا ہے۔

گزارش ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے جن آبا کا دین اختیار کرنے کا اقرار کیا تھا وہ سب خدا کے رسول تھے۔ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ (۲/۱۳۳): انھوں نے کہا کہ ہم تیرے اللہ اور تیرے آبا۔ ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق۔ کے الٰہ کی عبودیت اختیار کریں گے۔ یہ سب انبیاء تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اتفاق سے حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں کے آبا و اجداد بھی تھے۔ لہٰذا یہاں حضرات انبیاء کرامؑ کی روش کا اتباع مقصود ہے۔ اگر محض آبا کی تقلید مقصود ہوتی تو (حضرت) ابراہیمؑ کے بعد آزر کا نام بھی لیا ہوتا۔ وہ بھی تو ان کے آبا میں شامل تھا۔

(۷) آپ لکھتے ہیں

> باقی رہا ہر دور کے مسلمانوں کا اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل خود تلاش کرنا۔ تو اس سلسلے میں بھی انسانی عقل کو بالکل آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے اوپر وہی پابندیاں ہیں جن کا ذکر میں شروع میں اجتہاد کے سلسلہ میں کر چکا ہوں۔ اسلامی زندگی کی حقیقت باقی رکھنا ہے تو قرآن و اسلام کے مرکز سے وابستہ رہنا ہوگا اور اصولِ اجتہاد کے ساتھ اصولِ استناد کو ترتیب دینا ہوگا۔

محترم اللہ بخش صاحب نے ہمیں بتایا ہے، کہ وہ ایک عرصہ سے طلوعِ اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کر رہے ہیں۔ ہم ان سے استدعا کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ کیا وہ طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات میں کوئی ایک مقام بھی ایسا دکھا سکتے ہیں جہاں اجتہاد کے ساتھ یہ شرط نہ لگائی گئی ہو کہ وہ قرآن کی روشنی میں حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے گا۔ کیا انھوں نے طلوعِ اسلام کے مقاصد و مسلک میں سرفہرست یہ حقیقیں ملاحظہ نہیں فرمائیں کہ

> (۱) تنہا فکر انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہ نمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
>
> (۲) یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
>
> (۳) حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے وہ صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

کیا اس کے بعد بھی یہ کہا جائے گا کہ طلوعِ اسلام، انسانی عقل کو بالکل آزاد چھوڑ رہا ہے؟

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ تقلید و اجتہاد کی بحثوں میں (جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلی آ رہی ہیں) نقطۂ ماسکہ

افراد ہوتے ہیں۔ یعنی اجتہاد کے قائل یہ کہتے ہیں کہ جس طرح پہلے افراد (ائمہ کرام) کو اجتہاد کا حق حاصل تھا۔ اسی طرح اب ہم میں بھی ایسے افراد ہو سکتے ہیں جنہیں اجتہاد کا حق حاصل ہو۔ فریقِ مخالف کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ اجتہاد کا حق سابقہ افراد (ائمہ سلف) ہی کو حاصل تھا۔ اب کسی کو اس کا حق حاصل نہیں۔

ان کے خلاف، طلوعِ اسلام نے یہ تصور پیش کیا اور اسے اس بات پر فخر ہے کہ اس نے قرآن سے اس حقیقت کو سمجھ لیا) کہ اجتہاد کے سلسلہ میں افراد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا حق صرف اسلامی نظام کو ہے جسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہتے ہیں۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ نہیں کہ ہم اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر اجتہاد کرنے لگ جائیں۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ خلافت علیٰ منہاج رسالت کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ جو اجتہاد اس کی طرف سے ہوگا اس کی پابندی ہم سب پر لازمی ہوگی۔ سوچئے کہ جس طلوعِ اسلام کی دعوت اور مسلک یہ ہو اس کے متعلق یہ سمجھنا (اور اسی بنیاد پر اعتراضات کی عمارت کھڑی کر لینا) کہ وہ عقلِ انسانی کو آزاد چھوڑنے اور بلاحدود و قیود، اجتہاد کے عام اجازت دینے کا داعی ہے، کس قدر زیادتی ہے؛

(۸) آپ لکھتے ہیں کہ "علامہ اقبال صرف یہ چاہتے ہیں کہ اگر کسی وقت درخت کی شاخوں کی لچک قائم نہ رہی ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس درخت کی جڑ پر کلہاڑا چلا دیں۔"

ہم اپنے محترم سے عرض کریں گے کہ وہ طلوعِ اسلام کے اگست کے شمارہ کو ایک مرتبہ پھر پڑھیں اور ان میں ان سطور کو ذرا بغور ملاحظہ فرمائیں جن میں کہا گیا ہے کہ

> مسلمانوں سے جو کچھ کہنا چاہیئے (اور جسے آگے چل کر ذرا علامہ اقبال نے واضح کر دیا ہے کہ اپنے زوال و انحطاط سے اس نتیجہ پر نہ پہنچ جانا کہ یہ زوال اسلام سے متمسک رہنے کا نتیجہ ہے۔ اگر دین کو چھوڑ کر باقی دنیا کی طرح زندگی بسر کی جائے تو ہم بھی ترقی کر جائیں گے۔ ہمارا انحطاط اسلام سے متمسک رہنے کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلام کو چھوڑ کر انسانوں کا خود ساختہ مذہب اختیار کر لینے کا نتیجہ ہے۔

فرمائیے! کیا یہ درخت کی جڑ پر کلہاڑا چلانا ہے یا "شیخ چلی" سے یہ کہنا کہ جس شاخ پر بیٹھا ہے اسے ہی کیوں کاٹ رہا ہے؟

(۹) اس کے بعد آپ لکھتے ہیں

> اگرچہ آپ نے (طلوعِ اسلام نے) بھی اپنے مضمون کے آخر جا کر دبی زبان سے۔ نہایت مبہم طریقہ پر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ "جو کچھ علامہ کہنا چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ تم اپنے زوال سے گھبرا کر یورپ کی مادہ پرستی کا راستہ اختیار نہ کر لینا۔ ملت سے وابستہ رہنا اور قرآن کی طرف رجعت کی کوشش کرنا" لیکن یہ ایک سطر سات صفحات پر مشتمل فکر سے پیدا شدہ اثرات کی شدت کو کم نہیں کر سکتی۔

طلوعِ اسلام کبھی کوئی بات "دبی زبان اور مبہم طریقے سے" نہیں کیا کرتا۔ اس کا مشرب و مسلک یہ ہے کہ

بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

جو کچھ اس نے اس "ایک سطر" میں کہا ہے ذرا غور سے دیکھئے کہ اسی ایک مضمون میں اس نے اسے کس کس انداز و اسلوب سے دُہرایا ہے اس کے بعد، ذرا اس کے فائلوں کی ورق گردانی کیجئے اور دیکھئے کہ جو کچھ اس نے اس ایک سطر میں کہا ہے اس پر کتنے ہزار صفحات لکھے جا چکے ہیں۔ کیا ہمارے محترم یہ چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام ہر مقام پر ایک ایک نقطہ کے متعلق سینکڑوں صفحات لکھا کرے؟ وہ جب کوئی نئی بات کہتا ہے تو اس کے متعلق ضرور سینکڑوں صفحات لکھتا ہے۔ لیکن جب وہ سینکڑوں مرتبہ کہی ہوئی بات کا ذکر کرتا ہے تو اس کے متعلق چند الفاظ میں اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے ان قارئین کے لئے جو اس کی گزارشات کو غور و فکر سے پڑھتے ہیں، اتنا سا اشارہ کافی ہے۔

باقی رہا یہ کہ اس ایک سطر سے سات صفحات کے مضمون سے پیدا شدہ اثر زائل نہیں ہو سکتا۔ سو جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس سطر سے اس اثر کا زائل کرنا مقصود تھا، وہ ہماری بات کو سمجھا ہی نہیں۔ جو اثر ہمارا مضمون پیدا کرتا ہے وہ ہمارے نزدیک بالکل صحیح اور مبنی علی الحق ہے اس لئے اس کے زائل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اسے پھر دُہراتے ہیں کہ "جو کچھ حضرت علامہ کہنا چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ تم اپنے زوال سے گھبرا کر یورپ کی مادہ پرستی کا راستہ نہ اختیار کر لینا۔ ملت کے ساتھ وابستہ رہنا اور قرآن کی طرف رجعت کی کوشش کرنا۔ لیکن یہ کچھ کہنے کے لئے انہوں نے جو انداز اختیار کیا اس سے سخت مغالطہ پیدا ہو جانے کا احتمال ہی نہیں بلکہ یقین ہے۔ اس لئے ہم نے اس کی وضاحت ضروری سمجھی ہے۔" لیکن اگر کوئی اس پر اصرار کرتا ہے کہ علامہ کا مطلب یہی تھا کہ انحطاط کے زمانے میں اجتہاد حرام ہے تو ہم کھلے الفاظ میں کہیں گے کہ ایسا سمجھنا قرآن اور فلسفۂ تاریخ و سیاست دونوں کے خلاف ہے۔

(۱۰) آخر میں ہمارے محترم فرماتے ہیں کہ

ضرورت اس امر کی تھی کہ انتہا پسندانہ نقطہ نظر اختیار کرنے کے بجائے اعتدال و توسط کی راہ اختیار کی جاتی تاکہ قارئین کے سامنے مسئلہ کی پوری وضاحت ہو جاتی

ہماری تباہیوں کے وجوہ و اسباب میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے "انتہا پسندی" اور "اعتدال و توسط" کے معیار خود ہی مقرر کر رکھے ہیں اور پھر ہر نظریہ۔ ہر تصور۔ ہر خیال، ہر مسلک۔ ہر دعوت کو ان خود ساختہ معیاروں پر پرکھنے اور ان کی صحت و سقم پر حکم لگاتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ زندگی کے بعض معاملات ایسے ہیں جن میں اعتدال کی روش مستحسن ہوتی ہے۔ مثلاً دولت خرچ کرنے کے معاملہ میں بخل و اسراف (کی انتہا پسندانہ روش کے مقابلہ میں) میانہ روی سے کام لینا اچھا ہے۔ لیکن اگر آپ اسے کلیہ بنا کر ہر مقام پر اس کا اطلاق شروع کر دیں گے تو آپ کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔ توحید اور شرک دو متضاد نقاط ہیں۔ ذرا ان میں انتہا پسندانہ روش چھوڑ کر "اعتدال و توسط" کی راہ اختیار کر دیکھئے کہ آپ کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ

---

لہ لیکن یہ اصول بھی ذاتی احتیاجات تک محدود ہے۔ جب ملت کے اجتماعی مفاد اور نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا سوال آجائے تو پھر اپنی ضروریات سے زائد جو کچھ ہو، سب کا سب دیدینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس وقت "اعتدال و توسط" کی راہ کبھی مستحسن قرار نہیں پا سکتی۔

اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ (۷/۳) "جو کچھ اللہ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اور اس کے علاوہ کسی دوست یا سرپرست کا اتباع نہ کرو" دو متضاد نقاط میں جو ایک دوسرے سے انتہائی بُعد پر (Poles Asunder) واقع ہیں۔ ان میں اعتدال و توسط کی راہ، ایمان کی راہ نہیں۔ کفر کی راہ ہے۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) قرآن کا واضح۔ غیر مبہم اور ایسا انتہا پسندانہ فیصلہ ہے جس میں کسی قسم کے اعتدال و توسط کی گنجائش نہیں۔ اس پہ یہ ہے کہ ایک مدت کی اشخاص پرستی نے ہمارے ہاں وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ کی ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ہم اپنے پرستیدگان کی روش کو مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے سامنے لانے سے گھبراتے ہیں۔ تاکہ ان دونوں میں ٹکراؤ کی صورت میں ہمارے لئے "ایک کو چھوڑنے اور دوسرے کو رکھنے" کی کشاکش نہ پیدا ہو جائے اور اس جبن و مداہنت کو ہم کبھی اسلاف کے احترام اور کبھی اعتدال و توسط کی راہ کے نگاہ فریب مقدس پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یاد رکھئے۔ قرآن میں تدبر و تفکر سے زندگی کے تقاضوں کے حل دریافت کرنا، امت مسلمہ کا مستقل اور مسلسل فریضہ ہے۔ جو کسی دور میں بھی ساقط نہیں ہو سکتا۔ اُمت کی جو نسل بھی اس فریضہ کو چھوڑ دے گی۔ خدا کی رحمتوں سے محروم ہو جائے گی۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّھُمْ وَاَعْمٰٓی اَبْصَارَھُمْ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا (کی نعمتوں سے) محروم ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے انہیں بہرہ اور اندھا بنا دیا۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (۴۷/۲۳-۲۴) کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ یا ان کے دلوں پر تالے پڑ چکے ہیں۔


# طلوعِ اسلام کا لٹریچر انگریزی میں

ایک مدت سے یہ تجویز زیر غور تھی (اور اس کے لئے ہر طرف سے تقاضے موصول ہو رہے تھے) کہ طلوع اسلام کا لٹریچر انگریزی زبان میں بھی شائع کیا جائے۔ للہ الحمد کہ اب اس سلسلہ کی ابتدا کر دی گئی ہے۔

چنانچہ پہلا پمفلٹ معاشی نظام کے متعلق ہے۔ اسے ہزارہا کی تعداد میں چھپوایا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے ہر انگریزی خواں تک پہنچایا جائے۔ طلوع اسلام کی بزمیں اور متفقین حضرات، اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگا کر نہایت احتیاط سے تقسیم کریں۔

عام اشاعت کے پیش نظر اس کی قیمت صرف ایک آنہ فی پمفلٹ رکھی گئی ہے۔ (محصول ڈاک الگ ہوگا)

ملنے کا پتہ

ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۲۵۔بی۔ گل برگ۔ لاہور


۵۔ اور جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

# حقائق و عبر

## ۱۔ غیرت مند قومیں

ہمارے ہاں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب اخبارات میں اس قسم کی خبریں دکھائی نہ دیں کہ فلاں مقام پر ایک نوجوان شریف زادی کو اغوا کر لیا گیا۔ فلاں جگہ چند بدمعاشوں نے ایک معزز خاتون کی عصمت دری کرکے اسے گلا گھونٹ کر مار دیا۔ فلاں شہر میں ایک کمسن بچی کی آبروریزی کی گئی جس سے وہ ہسپتال تک پہنچنے سے پہلے مر گئی ہم میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو ان خبروں کی سرخیوں پر ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈال کر یوں آگے بڑھ جاتے ہیں جیسے یہ "ٹمبکٹو" کے واقعات ہیں جن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ جو ذرا اثر لیتے ہیں وہ پولیس۔ عدالت اور حکومت کو چند جلی کٹی سنا کر اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہم میں ملی غیرت ہی نہیں رہی۔ یہاں صورت یہ ہے کہ جس شخص کی بیٹی پر اس قسم کا حملہ ہوتا ہے ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیتے ہیں کہ اس معاملہ کا تعلق اس خاص شخص سے ہے۔ ہم سے نہیں۔ ہم میں اس بات کا قطعاً احساس بیدار نہیں ہوتا کہ وہ بیٹی اُس خاص شخص کی نہیں بلکہ ہم سب کی بیٹی ہے اور اس کی آبرو پر حملہ، قوم کی عزت اور آبرو پر حملہ ہے۔ اس لئے اس کا ازالہ اور روک تھام ہم سب کا یکساں فریضہ ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) ہم میں (انسانی حمیت تو بہت دُور کی بات ہے) ملی غیرت بھی نہیں رہی۔ دیکھئے کہ جس قوم میں ملی غیرت ہوتی ہے وہاں اس قسم کے واقعات پر قوم کی طرف سے ردعمل کیا ہوتا ہے۔

استنبول (ترکی) کی خبر ہے کہ وہاں کسی غنڈے نے ایک خاتون اور ایک دس سالہ بچی کی عصمت دری کرکے، ان دونوں (اور ان کے ساتھ دو اور بچیوں) کو ہلاک کر دیا۔ پولیس نے تفتیش کا جال بچھا دیا اور ملزم کو گرفتار کر لیا۔ جس دن ملزم نے عدالت میں پیش ہونا تھا، شہر کے قریب ایک لاکھ کے مجمع نے عدالت کی عمارت کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مجرم کو ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ اس کی تکا بوٹی کر دی جائے۔ (پاکستان ٹائمز ۹/۵)

یہ ہیں غیور قوموں کے احساسات! اس میں شبہ نہیں کہ جرائم کی روک تھام کا کام پولیس۔ حکومت اور عدالت کا ہے۔ لیکن مشینری قوم کے جذبۂ غیرت و احساس کی نسبت سے حرکت میں آتی اور آمادہ بہ عمل ہوتی ہے۔ جس واقعہ پر ایک لاکھ کا مجمع یوں مشتعل ہو جائے گویا وہ

حملہ خود ان کی اپنی بہو بیٹی پر ہوا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس واقعہ کی روک تھام کے لئے حکومت نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا! یہ کچھ ملی غیرت ہی کرا سکتی ہے۔

لیکن ہم میں ملی غیرت کہاں سے آسکتی ہے جب ہم اپنی ہزار ہا نوجوان بیٹیوں۔ بہنوں۔ ماؤں کو وحشی اور درندے سکھوں اور ہندوؤں کے حوالے کر آئے ہیں اور اس کے بعد بڑے مزے سے عیش کے دن گزار رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ ہماری بے غیرتی کی حد یہ ہے کہ اس کے بعد ہم انہی سکھوں اور ہندوؤں کو گلے لگا کر مل رہے ہیں۔ اور اس پر فخر کر رہے ہیں۔ جب ہم نے یہ کچھ برداشت کر لیا تو عصمت دری اور آبرو ریزی کے انفرادی واقعات سے ہمارے خون میں جوش کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

یاد رکھئے۔ قوموں کی زندگی ان کی ملی غیرت و حمیت کے پیمانوں سے ماپی جاتی ہے۔

---

## انسانی زندگی کی قیمت

قرآن نے کہا تھا کہ جس شخص نے کسی ایک فرد کی جان ہلاک کر دی، یوں سمجھو کہ اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک کی جان بچائی یوں سمجھو گویا اس نے پورے عالمِ انسانیت کو زندگی عطا کر دی۔ ہم قرآن کی ان آیات کو پڑھتے ہیں اور اس کا ثواب مردوں کو پہنچا کر قرآن کو طاق میں رکھ دیتے ہیں۔ لیکن جن اقوام و افراد کو انسانی زندگی کی قیمت کا احساس ہے دیکھئے کہ وہ ایک جان (نہایت غیر معروف اور عام پیمانوں کے لحاظ سے، بالکل معمولی جان) کو بچانے کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں۔

ڈانزگ کے ایک ہسپتال میں ایک نوجوان لڑکی وضع حمل کی تکلیف میں مبتلا تھی۔ اس کی حالت اتنی نازک ہو گئی کہ اس کے بچنے کی بہت کم امید باقی رہ گئی۔ تشخیص کے مطابق صرف ایک دوائی ایسی تھی جو اس کی جان بچا سکتی تھی لیکن وہ دوائی ڈانزگ اور اس کے قرب و جوار میں ناپید تھی۔ ڈاکٹر نے ریڈیو پر ایک عام اپیل کی کہ اگر کسی طرح وہ دوائی پہنچ جائے تو ایک انسانی جان بچ سکتی ہے۔ اس اپیل کو ہنتوور کے ایک عام آدمی نے سنا اور وہاں کے ایک اخبار نویس کو ٹیلی فون پر اس کے متعلق اطلاع دی۔ اخبار نویس نے برٹش ملٹری ہسپتال سے دوائی حاصل کی اور ہوائی جہاز میں اڑ کر سیدھا برلن پہنچا اور دوائی پولیس کے حوالے کر دی۔ انھوں نے وہ دوائی اس جہاز کے سپرد کی جو برلن سے ماسکو جا رہا تھا۔ یہ ہوائی جہاز خاص اس مقصد کے لئے وارسا میں اترا تاکہ دوائی ڈانزگ جانے والے جہاز کے حوالے کر دی جائے۔ اس جہاز نے وہ دوائی ڈاکٹر مذکور تک پہنچا دی اور اس طرح اس لڑکی کی جان بچ گئی۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز ۹/۵ء۱۵)۔

ایک یہ ملک ہے۔ اور ایک خیر سے ہمارا ملک ہے جس میں دوائی فروش اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب کسی پر مصیبت پڑے اور وہ دوائی کو بلیک مارکیٹ کی قیمت پر فروخت کر کے بیمار کے آنسوؤں سے روپیہ نچوڑیں۔ جس ملک میں انسانوں کے لباس میں درندے بستے ہوں وہاں انسانی جان کی قیمت کیا ہو سکتی ہے؟

درندے۔ انسان بنتے ہیں صحیح تعلیم و تربیت سے۔ اور یہ وہ جنس ہے جس کی اہمیت کا یہاں کسی کو احساس ہی نہیں۔

**۳۔ قرآن کریم کا سرکاری ترجمہ** اخبارات کی اطلاع کے مطابق، جامعہ ازہر (مصر) کی طرف سے علماء کرام کی ایک کمیٹی بدیں غرض منتخب کی جا رہی ہے کہ وہ قرآن کریم کا سرکاری (اوفیشل) ترجمہ مرتب کرے۔ یہ ترجمہ انگریزی جرمنی اور فرانسیسی زبانوں میں شائع کیا جائے گا۔ اور پیش لفظ میں اس کی صراحت کی جائے گی کہ اس ترجمہ کے علاوہ اور تراجم جامعہ ازہر کے نزدیک قابلِ سند نہیں ہوں گے (پاکستان ٹائمز ۹/۵۸)

مختلف مغربی زبانوں میں قرآن کریم کا ترجمہ شائع کرنے کی تجویز قابلِ مبارکباد ہے۔ لیکن تجویز کے اس ٹکڑے کو پڑھ کر کہ یہ ترجمہ سرکاری ہوگا اور اس کے علاوہ کوئی اور ترجمہ قابلِ قبول نہیں ہوگا، ہمارا ماتھا ٹھنکا ہے۔ ایک قرآنی معاشرے (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کو تو اس کا حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ "سرکاری ترجمہ" شائع کر کے باقی تراجم کو غیر مستند قرار دیدے۔ لیکن اگر مصر جیسی حکومت اور ازہر جیسے مکتب کو اس کا حق دیدیا جائے کہ ان کا ترجمہ مستند اور سرکاری ہوگا اور باقی تراجم غیر مستند تو ــــ کارِ طفلاں تمام خواہد شد ــــ ہماری قدامت پرستی نے قرآن کو پہلے ہی کچھ کم زنجیروں میں نہیں جکڑ رکھا جو اب مصری استبداد اور ازہری جمود کے اغلال و سلاسل کی مزید ضرورت لاحق ہو گئی ہو۔ ہمیں خدشہ یہ ہے کہ جب مصر کی طرف سے اس قسم کا ترجمہ شائع ہو گیا تو ہمارے ہاں اسے خواہ مخواہ سند قرار دیدیا جائے گا۔ اس لئے کہ ہمارے ذہنوں پر مصر (بلکہ باقی عربی ممالک) پر بھی اس بُری طرح سوار ہے کہ وہاں سے آئی ہوئی ہر چیز کو ہم خالص اسلامی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ مصر اور دیگر عرب ممالک میں بھی دین کے اجارہ دار بعینہٖ اسی ٹائپ کے ہیں جس ٹائپ کے ہمارے ہاں کے مُلّا ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ وہاں کے مُلّا کو اس کا بھی زعم ہے کہ "ہم قرآن کی زبان بولتے ہیں"۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک صحیح دینی فکر اور قرآنی نگاہ کا تعلق ہے، پاکستان، مسلمانوں کے تمام ممالک میں، سب سے آگے ہے۔

علمائے ازہر کے متعلق، علامہ رشید رضا۔ اپنے استاذ مفتی محمد عبدہٗ کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

**ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی۔**

علامہ محمد عبدہٗ مزید کہتے ہیں۔

**جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیلِ علم کرتا ہے اتنی ہی اس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔**

(تفسیر المنار ــــ جلد اول ــــ صفحہ ۱۸۱)

اس قول کی صداقت کا تھوڑا سا ثبوت اہلِ پاکستان کو گذشتہ کلوکیم کے دوران میں ہو گیا تھا جب انھوں نے دیکھا تھا کہ عرب کے یہ علماء فکر و نظر سے کس حد تک محروم تھے۔ واقعی ایسا نظر آتا تھا کہ ان لوگوں میں کسی صحیح بات کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔

ہم مصر کے ارباب متعلقہ سے گزارش کریں گے کہ وہ قرآن کریم کا مجوزہ ترجمہ بڑے شوق سے شائع کریں لیکن اس کی حیثیت انفرادی رہنے دیں۔ بائبل کے (King's version) کے اتباع میں اس ترجمہ کو سرکاری حیثیت دینے سے بہت سی

خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

⁂

## ۴۔ دینداروں کی دیانت

(ہمارے ارباب شریعت جنہیں اپنے ورع و تقوئی اور دیانت و امانت پر بڑا ناز ہوتا ہے) طلوع اسلام کے خلاف، کذب آفرینی اور تہمت تراشی میں کس بُری طرح سے سرگرم عمل ہیں اس کی ایک تازہ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان، مجلّہ رحیق (لاہور) کی اگست دسمبر ۱۹۵۸ء کی (مشترکہ) اشاعت میں، مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

معاصر طلوع اسلام (بابت جون ۱۹۵۸ء) نے ماہنامہ رحیق بابت اپریل ۱۹۵۸ء میں شائع شدہ مضمون "احادیث نبویہ کی جمعیت و حفاظت" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ میری حدیثوں کے رد و قبول کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو اسے قبول کرو اور جو اس سے مخالف نظر آئے اسے رد کردو تو آپ بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ حدیث صحیح ہے رسول اللہ نے ضرور ایسا فرمایا ہوگا کیونکہ رسول اللہ قرآن کے خلاف کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ جواب آپ ہی کا نہ ہوگا بلکہ ہر اس شخص کا ہوگا جو قرآن کی تعلیم۔ سنت نبوی کی روح اور حضور کی سیرت طیبہ پر ذرا بھی نگاہ رکھتا ہو"

اوپر کے اقتباس میں لفظ "رسول اللہ" کے الفاظ پر جو نشان (سلہ) دیا گیا ہے اس کے متعلق رحیق نے حسب ذیل فٹ نوٹ لکھا ہے۔

سلہ پرویزی پارٹی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ درود شریف نہیں لکھتی۔

یہ جرم واقعی بہت بڑا ہے جس سے جذبات کا مشتعل ہو جانا یقینی ہے۔ لیکن آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ طلوع اسلام کا جو اقتباس رحیق نے شائع کیا ہے۔ اس میں جہاں جہاں نبی اکرمؐ کا ذکر آیا ہے وہ مقامات طلوع اسلام میں اس طرح چھپے ہیں

رسول اللہؐ نے فرمایا..... رسول اللہؐ نے ضرور ایسا فرمایا ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہؐ قرآن کے خلاف کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے..... قرآن کی تعلیم۔ سنت نبویؐ کی روح اور حضورؐ کی سیرت طیبہ.....

(طلوع اسلام۔ بابت جون ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۵۳)

یعنی طلوع اسلام میں، نبی اکرمؐ کے اسم گرامی پر ہر جگہ (صلی اللہ علیہ وسلم کا مروج مخفف نشان) صلعم موجود ہے۔ لیکن ان مدعیانِ اتباعِ سنت نے پہلے تو اقتباس میں، ہر مقام سے صلعم کا نشان حذف کر دیا اور پھر خود ہی نیچے نوٹ دے دیا کہ

پرویزی پارٹی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ درود شریف نہیں لکھتی۔

کیا بد دیانتی کی اس سے بڑی مثال کہیں اور بھی مل سکتی ہے۔؟

※

**۵— عورت کی حیثیت** جماعتِ اہلِ حدیث کے دوسرے آرگن، معاصر منہاج کی ۱-۱۵ ستمبر کی اشاعت میں، حضرت ابوالحسن علی ہجویریؒ " (یعنی داتا گنج بخش) پر ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عورت کے متعلق حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں۔

> بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا اس کا اصل یہی عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا۔ یعنی ہابیل وقابیل کی لڑائی۔ اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی فتنوں کے تمام اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش (علی ہجویریؒ) کا صوفیائے کرام میں بہت بڑا مقام بتایا جاتا ہے اور منہاج، جماعتِ اہلِ حدیث کا ترجمان ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہماری طریقت اور شریعت، دونوں میں، عورت کی پوزیشن وہ ہے جس کا ذکر داتا صاحب نے فرمایا ہے — تمام فتنوں کا سرچشمہ — دنیا بھر کی برائیوں کی اصل۔

ارباب طریقت سے کچھ پوچھنا تو بیکار ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اولیاء کرام کا ہر فرمودہ دین میں سند ہے کیونکہ اس کی بنا کشف والہام پر ہوتی ہے۔ لیکن ہم معاصر منہاج سے اتنا ضرور دریافت کرنا چاہتے کہ آپ حضرات بتایا کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تمہاری دنیا میں سے میرے لئے تین چیزیں محبوب بنا دی گئی ہیں۔ خوشبو۔ عورت اور نماز۔ سوال یہ ہے کہ اگر عورت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تمام فتنوں کا سرچشمہ اور ہر برائی کا سبب ہے تو ایسی جنس کو حضورؐ نے کس طرح پسند فرمایا؟

اسی ضمن میں ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ داتا صاحب نے اپنے بیان میں جن تین واقعات کا ذکر فرمایا ہے وہ قرآن کریم میں بھی مذکور ہیں یعنی۔ آدم کا فتنہ۔ ہابیل وقابیل کی لڑائی اور ہاروت و ماروت کا واقعہ" قرآن نے ان میں سے کسی کے متعلق بھی یہ نہیں کہا کہ اس کا سبب عورت تھی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریحات کے مقابلہ میں داتا صاحب کے بیان کو کیا حیثیت دی جائے۔[1]

اسی سلسلہ میں یہ نقطہ بھی قابلِ غور ہے کہ یہ مقالہ شائع ہوتا ہے جماعتِ اہلِ حدیث کے ترجمان، منہاج میں اور اس پر کوئی تردیدی یا تنقیدی نوٹ نہیں دیا جاتا۔ ان کی تنقیدات واعتراضات کے سنان ونشتر صرف ان سینوں کے لئے وقف ہیں جن سے قرآن کی آواز بلند ہوتی ہے۔

---

[1] چونکہ ہمارے تصوف کی بنیاد عیسائیوں کی رہبانیت پر ہے اس لئے اس میں عورت کے متعلق اس قسم کے خیالات کا پایا جانا ضروری ہے۔

## ۶- اسلاف کا زمانہ

ہمارے ہاں ہر محراب و منبر سے یہ آواز پیہم اور مسلسل سنائی دیتی ہے کہ ہمارا زمانہ فسق و فجور اور شر و فساد کا زمانہ ہے۔ اسلاف کا زمانہ ورع و تقویٰ اور نور و رحمت کا زمانہ تھا اس لئے ہمیں اپنی نگاہ اُس درخشندہ دور کی طرف رکھنی چاہیئے۔ حضرت علی ہجویریؒ (داتا صاحب) چوتھی صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے زمانے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

> خداوند بزرگ و برتر نے ہمیں اس زمانے میں پیدا کیا ہے جب لوگوں نے حرص و لالچ کا نام شریعت، تکبر و ریاست طلبی کا نام عزت اور علم۔ ریا کا نام خوفِ الٰہی اور دل میں کینہ پوشیدہ رکھنے کا نام حلم۔ لڑائی جھگڑے کا نام بحث و مباحثہ۔ ہذیانِ طبع کا نام معرفت۔ نفسانی خواہشوں اور دل کی حرکتوں کا نام محبت۔ خدا کے راستے سے منحرف اور بے دین ہو جانے کا نام فقر۔ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ۔ اور ترک شریعت کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔
>
> (بحوالہ صدر مقالہ۔ منہاج ۲۱ ستمبر)

## ۷- بزرگانِ کرام

یہ تو رہا اُس زمانے کی عام کیفیت کے متعلق۔ جہاں تک اس دور کے بزرگانِ کرام کا تعلق ہے، زیر بحث مقالہ میں لکھا ہے کہ

> آپ (حضرت داتا صاحب) نے اپنے معاصرینؒ، مثلاً ذوالنون مصری - خواجہ بایزید بسطامی - منصور حلاج - اور ابو سلمان کے حلولی فرقوں کو ملحد و لعنتی کہا ہے۔

یہ ہے داتا صاحب کا بیان اِن حضرات کے متعلق۔ آپ ان میں سے کسی کے متعلق اتنا سا بھی کہہ دیجئے کہ ان کی فلاں بات کی سند قرآن سے نہیں ملتی اور پھر دیکھئے کہ اسلاف پرست طبقہ کے ہاتھوں آپ کا کیا حشر ہوتا ہے۔

یاد رکھئے۔ اسلاف ہوں یا اخلاف - جب تک، آپ ان کے اقوال و اعمال کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھنے کا مسلک اختیار نہیں کرتے، آپ حقیقت کے قریب کبھی نہیں آسکتے - یہی دین قیّم ہے۔

⁂

## ۸- شریف باپ

اگر آپ دیکھیں کہ ایک شخص کا مکان گر چکا ہے، اس کے بیوی بچے، سڑک کے کنارے، درخت کے نیچے پناہ گزیں ہیں۔ ان کا ساز و سامان سب تباہ ہو گیا ہے۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بیوی کے پاس اوڑھنے کو کپڑا نہیں۔ اور وہ شخص میٹروپول ہوٹل میں بڑے مزے سے ڈنر کھا رہا ہے تو آپ ایسے آدمی کے متعلق کیا کہیں گے ؟

ایک مرتبہ پھر دہرائیے کہ آپ کیا کہیں گے ؟

اوائل ستمبر میں لاہور اور اس کے مضافات میں بے پناہ بارش ہوئی۔ اس کی وجہ سے، جو نقصانات ہوئے ان کا اندازہ، سرکاری بیان کے مطابق حسب ذیل تھا۔

(۱) شہر، مضافاتی بستیوں اور نواحی دیہاتوں میں چودہ ہزار خاندان بے گھر ہو گئے۔

(۲) تحصیل قصور میں اٹھارہ ہزار ایکڑ اور تحصیل چونیاں میں آٹھ ہزار ایکڑ رقبہ میں کھڑی فصلیں بارش کے جمع شدہ پانی میں ڈوب کر برباد ہو گئیں۔

(۳) ۱۵۳ پختہ مکانوں کے علاوہ ۹۶۶۸ کچے مکانات یا تو منہدم ہو گئے یا انہیں شدید نقصان پہنچا۔

(۴) ۱۴۱۴۱۸۳ من بھوسہ اور ۶۲۳۵۳ من غلہ برباد ہو گیا۔ وغیرہ

(امروز ۱۱/۹/۵۵)

جن دنوں یہ ہزار ہا خاندان بے گھر ہو رہے تھے اور انہیں نہ سر چھپانے کو چھت۔ نہ کھانے کو روٹی نہ اوڑھنے کو کپڑا میسر تھا (اور ان میں سے اکثر کی ابھی تک یہی حالت ہوگی) ہمارے ارباب حل و عقد اپنے معمول کے مطابق اپنی کوٹھیوں میں کھاتے پیتے۔ ہنستے کھیلتے تھے۔ نہ ان کے سر پر پانی کی ایک بوند ٹپکی۔ نہ ان کے ریچھے تو ایک طرف) کتوں تک کی نیند میں خلل آیا۔ اگر ان میں سے کوئی سیلاب زدہ علاقہ تک پہنچا بھی تو اس لئے کہ دوسرے دن اخبارات میں اس کی تصویر چھپ جائے اور وہ آنے والے یوم الحساب۔ یعنی الیکشن میں) بوقت ضرورت کام آسکے۔

اور اس کا کسے علم نہیں کہ افراد معاشرہ کے ساتھ ارباب نظم و نسق کا تعلق، ماں باپ کا ہوتا ہے۔ (ہمارے بول میں تو حاکم کو کہتے ہی "مائی باپ" تھے) یہ ہے اس "ماں باپ" کا تعلق اولاد کے ساتھ اور اس کے بعد یہ متوقع ہیں کہ بچے ان کا ادب و احترام کریں اور ان کے مطیع و فرمانبردار بن کر جئیں۔ یاد رکھئے۔ ادب و احترام کے جذبات، ماں باپ کی شفقت و پرورش سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے مستحق وہی ہوتے ہیں جو یہ اعلان کریں کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی
بازپرس ہوگی۔

(امیر المؤمنین حضرت عمر ابن الخطابؓ کا ارشاد)

٭٭

۱۷ ستمبر کے نوائے وقت (لاہور) میں ذیل کی خبر شائع ہوئی ہے۔

## وہابی سنی کا تنازعہ

ڈھوک عبدالوہاب تھانہ جاتلی کی مسجد کی امامت کا مسئلہ نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ گذشتہ روز یہاں کی دو پارٹیاں پیش امام کے تقرر کے سلسلے میں ایک دوسرے کے خلاف مسلح ہو کر صف آرا ہو گئیں۔ لیکن پولیس نے موقع پر پہنچ کر دونوں پارٹیوں کے ۶۷ افراد کو اندیشۂ نقضِ امن کے تحت حراست میں لے لیا۔

اس تنازعہ کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ڈھوک عبدالوہاب مسجد کے پیش امام کی حیثیت سے ایک شخص مولوی غلام رسول ایک طویل عرصہ سے فرائض انجام دے رہے تھے مگر کچھ دنوں سے بعض لوگوں کو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ وہ "وہابی" ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف مولوی صاحب کو برسرِ عام "وہابی" کہنا شروع کر دیا بلکہ ایک اور مولوی حبیب خاں کو مسجد کا پیش امام

مقرر کر دیا۔ اس طرح اس مسجد میں بیک وقت دو نمازیں باجماعت ادا کی جانے لگیں۔ اس پر مولوی حبیب خاں کی پارٹی نے کوشش کی کہ مولوی غلام رسول اور ان کے مقتدی مسجد میں نہ آئیں۔ کیونکہ وہ "وہابی" ہیں۔ اس کے برعکس مولوی غلام رسول اور ان کے مقتدی انہیں اہل سنت و الجماعت قرار دیتے رہے۔ کل شام اس تنازعہ نے شدت اختیار کر لی اور دونوں مولویوں کی پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف لاٹھیاں کلہاڑیاں اور گنڈاسے لے کر میدان میں نکل آئیں۔ خوفناک فساد برپا ہونے کے قریب تھا کہ پولیس نے موقع پر پہنچ کر صورت حال پر قابو پا لیا اور دونوں پارٹیوں کے ۲۷ افراد کو حراست میں لے لیا۔ بعد میں انہیں ایک مقامی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں ان سب کی ضمانتیں منظور کر لی گئیں۔

یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں۔ اس قسم کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو معاملہ قتل تک پہنچ جاتا ہے۔ اس ضمن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جو گہرے غور و فکر کے محتاج ہیں۔ مثلاً

(۱) کیا قرآن بھی "وہابی سنی" وغیرہ فرقوں کو تسلیم کرتا ہے؟

(قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے)

(۲) کیا رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی یہ فرقے موجود تھے؟

(فرقے تو ایک طرف، اُس زمانے میں ان الفاظ تک کا وجود نہیں ملتا)

(۳) جب فرقہ بندی نہ قرآن کی رُو سے جائز ہے نہ سُنّتِ رسول اللہؐ کی رو سے۔ تو پھر ہمارے ہاں کے اکتیس علمائے کرام نے اپنی متفقہ کوششوں سے، دستور پاکستان میں "مسلمہ فرقوں" کے تحفظ کا سامان کیوں کرایا تھا؟

(اس کا جواب ان علمائے کرام سے پوچھئے یا ان دینداروں سے جو اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے ان علمائے کرام کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔)

(۴) جب فرقوں کی باہمی عداوت کا یہ حال ہے تو کیا ان کے مٹنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟

(اس کی صرف ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ پھر سے قرآنی نظام قائم کیا جائے جو ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک امت ایک نظام۔ ایک آئین کی رو سے ان فرقوں کو مٹا کر عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ والے اسلام کو متشکل کر دے۔ اس کے سوا فرقوں کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں۔)

✲

## نادان کی دوستی

ہمارا دور جہاں اپنی اس سعادت پر ناز کرے گا کہ اس میں دعوت الی القرآن کی آواز اس وسعت اور بلند آہنگی سے ابھری، وہاں اس سوختہ بختی پر ماتم کرے گا کہ خود اپنوں نے قرآن سے دشمنی کا ایسا ثبوت دیا جس کی ہمت بیگانوں کو بھی بہت کم پڑتی تھی۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے مطالب نہایت روشن اور اس کی تعلیم بڑی صاف اور واضح ہے اس میں نہ کسی قسم کا ابہام ہے، نہ پیچیدگی، نہ ریب ہے نہ التباس۔ یہ نور ہے جو اپنی ذات میں خود بھی روشن

ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ قرآن کا یہی دعوے ہے جو قرآنی فکر و تعلیم کو عام کرنے والوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس دعوت کے مخالفین قرآن کے اس دعوے کو (معاذ اللہ) باطل قرار دینے میں ایڑھی چوٹی کا زور لگائے جا رہے اور اپنی اس مذموم کوشش کو جہاد عظیم تصور کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں، جماعت اہل حدیث کے ترجمان "منہاج" (لاہور) میں، مولانا ابو یحییٰ خان نوشہروی، کے قلم سے ایک مقالہ (قسط وار) شائع ہو رہا ہے، جس کا انداز یہ ہے کہ قرآن کی آیات پر آیات پیش کی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ بتاؤ! ان کا کوئی مطلب سمجھ میں آتا ہے؟ ان کے کوئی معنی بنتے ہیں؟ اس کے بعد احادیث پیش کی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ دیکھئے! اب اس آیت کا مفہوم کیسے واضح ہو گیا۔ اب بات کس وضاحت سے سمجھ میں آ گئی!

مقالہ نگار صاحب اپنی اس تحقیق انیق کو سپرد قلم کر کے۔ معاصر منہاج اسے چھاپ کر اور منہاج کے قارئین اسے پڑھ کر بغلیں بجاتے ہوں گے کہ دیکھئے۔ ان قرآن پکارنے والوں کو کس طرح چاروں شانے چت گرا لیا گیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کا خیال اس طرف نہیں جاتا ہو گا کہ یہ زد جا کر پڑتی کس پر ہے؟ ان میں سے کوئی نہیں سوچتا ہو گا کہ کیا یہ وہی اعتراضات نہیں جنھیں قرآن کے خلاف پادری فنڈر اور ہاشم رامچند مناظروں میں آگے بڑھایا کرتے تھے! انھیں کون سمجھائے کہ نبی اکرمؐ خدا کا پیغام لانے والے تھے۔ خدا کے پیغام کو (معاذ اللہ) مہمل مبہم یا ناقص ثابت کرنے سے، پیغام لانے والے کی عزت افزائی نہیں ہوتی۔ اللہ کی شان گھٹانے سے رسول اللہ کی شان بڑھتی نہیں۔ اس سے (نعوذ باللہ) دونوں کی شان گھٹتی ہے۔

باقی رہیں وہ آیات جنھیں اس طرح پیش کیا جا رہا ہے، سو اس ضمن میں اصولاً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم نے بعض احکام کی جزئیات بھی خود ہی متعین کر دی ہیں اور بعض کو صرف اصولی طور پر بیان کیا ہے۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں کیونکہ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہیں تھا۔ ان اصولی احکام کی جزئیات نبی اکرمؐ نے (وشاورھم فی الامر کے قرآنی حکم کے مطابق) صحابہ کے مشورہ سے متعین فرمائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا (معاذ اللہ) سہو یا نقص نہیں۔ اس نے دانستہ ایسا کیا ہے۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ ان جزئیات کو بھی غیر متبدل قرار دیں۔ لیکن یہ کہنا کہ رسول اللہؐ نے ان جزئیات کو متعین کر کے قرآن کے (معاذ اللہ) نقص کو دور کر دیا ہے، قرآن اور صاحب قرآن دونوں کی سوء ادبی ہے۔ مخالفت کے جوش میں انسان کو اس حد تک اندھا نہیں ہو جانا چاہیئے۔


مجرب دوائی دمہ و درد گردہ

حاجی محمد دین صاحب شیخ آئل فیکٹری۔ اورنج اسٹریٹ۔ لارنس کوارٹرس
کراچی سے۔ مفت منگوائیے

# تعارفِ کتب

ہندوستان میں حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے۔

An Outline Of the Cultural History Of India

اسے (حیدر آباد۔ دکن) کے ڈاکٹر ایس۔ اے لطیف صاحب نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس میں ایک باب کا عنوان ہے

ہندوستان میں جدید مذہبی رجحانات

اس باب میں حضرت علامہ اقبالؒ اور ان سے متعلق مکتبِ فکر کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

اقبال کے نظریۂ خودی نے ملک کے نوجوان طبقہ کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ازاں بعد انھوں نے (علامہ اقبال نے) اپنے اس تصور کو، اپنی اردو اور فارسی کی تحریرات میں مختلف انداز اور متنوع اسالیب سے پیش کیا۔ لیکن اس تصور کے متعلق زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ (اقبال کی تشریحات کے باوجود) اس کی حیثیت بجلی کے چمکاروں سے بیش نہ تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے (اپنے مشہور خطبات تشکیل الہٰیات) میں ان درخشندہ چمکاروں میں بڑی حد تک وسعت پیدا کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر باقی رہتی ہے کہ انھوں نے ان چمکاروں کو مسلسل نور کی ندی میں تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یعنی انھوں نے اسے ایک مرتب و مربوط فلسفہ کی شکل نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فکرِ اقبال کے متبعین اس بارے میں آزاد چھوڑ دیئے گئے کہ وہ اس فکر کی تعبیر اپنی اپنی صوابدید کے مطابق کرلیں۔ ظاہر ہے کہ اس تعبیر میں ہر ایک کا انداز معروضی ہوسکتا تھا۔

ان اربابِ نظر میں جنھوں نے، شعروں کی فضا میں پھیلی ہوئی فکرِ اقبالؒ کو نثر کے لباس میں پیش کیا اور اس میں ربط و نظم محسوس کیا، سب سے نمایاں ہستی، محترم غلام احمد پرویز کی ہے، جو ایک ایسی تحریک کے قائد ہیں

جس کا مقصد مذہبی اصلاح ہے۔ اور جب وہ اپنے ماہوار مجلہ طلوع اسلام (جو اب کراچی سے شائع ہوتا ہے[1]) اور قرآنی فکر سے متعلق متعدد تصانیف کے ذریعے ملک میں پھیلا رہے ہیں۔ اس تحریک کا اولیں مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل جدید ان معاشی بنیادوں پر کی جائے جو بعض گوشوں میں مارکسزم سے بھی زیادہ انقلابی ہیں۔

ہم اس ضمن میں اتنی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ طلوع اسلام کی تحریک کا اولیں اور آخری مقصد، معاشرہ کو قرآنی بنیادوں پر متشکل کرنا ہے۔ معاشی نظم، اس تشکیل جدید کا صرف ایک گوشہ ہے۔ باقی رہا قرآن کے معاشی نظام کا مارکسزم سے زیادہ انقلاب آفریں ہونا، تو اس میں کسی قسم کا کلام نہیں کہ

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت "فتنۂ فردا" نہیں اسلام ہے

ہم محترم ڈاکٹر لطیف صاحب کو در خور تبریک و تحسین سمجھتے ہیں کہ وہ تحریک جس میں پاکستان کی بیشتر نگاہوں کو "فتنۂ انکار حدیث" سے زیادہ کچھ نظر نہ آیا، ان کی نگہ ژرف بیں اور حقیقت شناس نے اس میں مذہبی اصلاح اور اسلام کی بنیادوں پر معاشی تشکیل جدید کی جھلک دیکھ لی۔۔ ایسی تشکیل جدید جو ان کی نظروں میں، مارکسزم سے بھی زیادہ انقلاب آفریں ہے۔ فھو المقصود۔

---

[1] اور اب لاہور سے۔


# من و یزداں

## چھپ کر تیار ہو گئی ہے

کہنے کو تو یہ کتاب معارف القرآن جلد اول کا تیسرا ایڈیشن ہے لیکن مصنف کی نظر ثانی نے اسے عجیب و غریب تصنیف بنا دیا ہے اس میں خدا اور انسان کے باہمی تعلق کو اس خوبصورتی اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ چیز اور کہیں نہیں مل سکتی۔ نیز تقدیر اور دعا جیسے عنوانات کو از سر نو لکھا گیا ہے اور اس مشکل ترین مسئلہ کو اس حسن و خوبی سے سلجھایا گیا ہے کہ اس کے بعد ذہن میں کسی قسم کا الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ کتاب معارف القرآن کے ۲۵۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ قیمت (مجلد مع گرد پوش) دس روپے فی جلد

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵-بی۔ گلبرگ لاہور

# طلوعِ اسلام اور اس کے دفتر کے متعلق

۱۔ طلوع اسلام کا دفتر 25-B گل برگ (لاہور) میں واقع ہے۔ لاہور شہر سے کئی ایک سڑکیں مغلپورہ والی نہر سے آکر ملتی ہیں۔ ان سڑکوں سے نہر تک آکر، نہر کو عبور نہ کریں بلکہ اس کے کنارے کے ساتھ چلتے جائیں تا آنکہ آپ ایف۔ سی کالج والے پل تک آ پہنچیں۔ وہاں سے پل پار کرکے، سیدھی سڑک پر ہولیں۔ قریب چار فرلانگ کے بعد، پانی کی اونچی سی ٹینکی آئے گی۔ اس کے ساتھ ہی 25/B واقع ہے۔ یعنی گل برگ کی مارکیٹ سے متصل۔

۲۔ بس میں آنا ہو تو بس والے سے بی (B) بلاک کا بس اسٹینڈ کہئے۔ (پی۔ P۔ نہیں بلکہ B)۔ اسٹینڈ پر طلوع اسلام کا بڑا سا بورڈ ہے جس پر دفتر کی سمت تیر کا نشان ہے۔ اُس سمت، قریب پچاس قدم کے فاصلے پر دفتر ہے۔ نمبر سے بس ۱۷ اور ۳۷ دفتر کی طرف آتی ہیں۔

۳۔ دفتر کے اوقات صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے۔ اور شام ۲ بجے سے ۵ بجے تک ہیں۔ (اتوار کے دن دفتر بند رہتا ہے لیکن صبح درس کے وقت کتابیں، رسالہ اور پمفلٹ مل سکتے ہیں۔)

۴۔ دفتر کا ٹیلیفون نمبر 7500 ہے۔

۵۔ رسالہ طلوع اسلام، ہر مہینے کی آخری تاریخ کو پوسٹ کیا جاتا ہے۔ پوسٹ کرنے سے پہلے ہر ایک خریدار کا پرچہ چیک کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود (ڈاک خانہ کی بدنظمی کی وجہ سے) بعض خریداروں تک پرچے نہیں پہنچتے۔ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ سے پہلے آجانی چاہیئے۔ بعد میں اطلاع آنے کی صورت میں پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ زائد پرچہ دفتر میں موجود ہو۔

۶۔ خط و کتابت میں اپنا خریداری نمبر ضرور دیجئے۔ اور پتہ صاف لکھئے۔

۷۔ رسالہ اور کتابیں، وی۔ پی منگانے کے بجائے اگر آپ منی آرڈر بھیجدیں تو آپ کو ڈاک خرچ میں کفایت رہے گی۔

۸۔ ہر خریدار کا بالعموم اور پیشگی خریداروں کا بالخصوص حساب بڑی احتیاط سے رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حساب میں

غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اگر آپ اپنے حساب میں کوئی غلطی دیکھیں تو (بلا فروختہ ہوئے بغیر) دفتر کو اس سے مطلع فرما دیں۔ دفتر آپ کا شکر گزار ہوگا۔

۹۔ خط و کتابت کرتے وقت اسے یاد رکھئے کہ آپ کے اور دفتر کے درمیان محکمہ ڈاک بھی آجاتا ہے جس میں بہت سا تساہل تغافل اور بے ضابطگیوں کا امکان ہے۔ اس لئے دفتر کو موردِ الزام قرار دینے میں عجلت نہ کیجئے۔

۱۰۔ خط و کتابت انتظامی امور کے متعلق ناظم سے اور طلوع اسلام کے مضامین یا استفسارات کے سلسلہ میں مدیر سے کیجئے۔ محترم پرویز صاحب کے نام صرف وہی خطوط بھیجئے جن کا تعلق ان کی ذات سے ہو۔

(۱۱) پرویز صاحب بھی 25-B میں قیام پذیر ہیں اور وہیں ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ صبح کے وقت بہت مصروف ہوتے ہیں اس لئے سہ پہر کے بعد ملاقات کا وقت مناسب رہتا ہے۔ اس کے لئے آپ ناظم ادارہ سے پہلے (ٹیلیفون پر) وقت لے لیں تاکہ آپ کو تکلیف فرما کر آنے کے بعد مایوسی نہ ہو۔

(۱۲) پرویز صاحب کا درس قرآن بھی ۲۵۔ بی میں ہر اتوار، صبح ساڑھے آٹھ بجے سے دس بجے تک ہوتا ہے۔

(۱۳) طلوع اسلام کی قرآنی تحریک سے جن لوگوں کے مفاد پر زد پڑتی ہے وہ اس کے خلاف قسم قسم کی تہمت تراشیوں اور کذب آفرینیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ جب آپ تک کوئی ایسی بات پہنچائے تو اس سے کہئے کہ اس کی بابت طلوع اسلام کی تحریر دکھائیے۔ اور یا آپ براہ راست طلوع اسلام سے دریافت کیجئے۔ اس کے بغیر کسی کی بات کا اعتبار نہ کیجئے۔

سراج الحق
ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵۔ بی۔ گل برگ۔ لاہور


# مقامِ محمدیؐ

ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں اس پمفلٹ کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچائیے تاکہ یہ حقیقت عام ہو جائے کہ حضور نبی اکرمؐ انسانیت کے کس بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ قیمت فی پمفلٹ چار آنے۔

ملنے کا پتہ ناظم ادارہ طلوع اسلام، ۲۵۔ بی گل برگ کالونی لاہور

مذاکرہ عالم اسلامی (لاہور)

# جدید تصورات اور معاشرتی اقدار کی طرف سے اسلامی معاشرے کو دعوتِ مبارزت

(از: ڈاکٹر رچرڈ۔ این۔ فرائی (ہارورڈ یونیورسٹی۔ امریکہ)

آج کل اکثر اس پیکار کا ذکر سننے میں آتا ہے جو اذہانِ انسانی میں مغرب اور سوویت اشتراکیت کے درمیان جاری ہے۔ سیاستداں اور حالاتِ حاضرہ کا مطالعہ کرنے والے جب اس کا اطلاق شرقِ اوسط بلکہ مشرق کے کسی بھی ملک پر کرتے ہیں تو یہ تصفیہ کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ ہم ان دونوں میں سے کسی ایک تصور کی حمایت پر مجبور سے ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ اکثر یہ امر فراموش کر جاتے ہیں کہ اہلِ شرق خلا میں نہیں رہتے بلکہ وہ ایسی ثقافتوں کے حامل ہیں جو مشرق میں مغرب اور سوویت مسابقت کے سلسلے میں انتہائی بڑی نہیں تو فیصلہ کن حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ مغربی یورپ اور سوویت ثقافت کا جائزہ لیتے وقت شرقِ اوسط کی اسلامی تہذیب پر نظر رکھنا بھی لازم ہے کیونکہ ان میں سے ہر ثقافت ایک دوسرے سے جدا اور ممیز ہونے کے باوجود کسی نہ کسی اعتبار سے باہم مربوط بھی ہے۔ اگر اشتراکیت کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ انیسویں صدی کے مغربی یورپ کی آزاد خیالی کے ایک اہم پہلو اور انسان کو کائنات کا مرکز و محور بنانے کے رجحان کا منطقی نتیجہ ہے تو اس صورت میں بھی یہ ضروری ہو گا کہ اس کی اپنی ثقافت کی بناء پر سوویت روس کو مغرب سے جداگانہ حیثیت دیں۔ یہی حال اسلام کا ہے کہ اگرچہ اس پر مغربی تصورات بہت حد تک اثر انداز ہوئے ہیں پھر بھی اس کی اپنی ایک ثقافت ہے۔ لہٰذا اس کا مطالعہ اسی حیثیت سے کرنا چاہیئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ اس کا آسان جواب تو بلاشبہ یہی ہو گا کہ یہ دنیا کے عظیم مذاہب میں سے ہے، لیکن محض یہ جواب کافی نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے بارے میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ یہ مذہب سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے۔ یہ ایک ثقافت ہے، مجموعی اعتبار سے یعنی معاشرتی پہلو سے بھی اور انفرادی پہلو سے بھی۔ یہ ایک نظریۂ حیات بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم معتقداتِ اسلامی یا مذہبِ اسلام سے علیحدہ اور ممیز کر کے مختلف نظریاتِ حکومت یا قانون یا تصوراتِ فن یا جمالیات سے بحث نہیں کر سکتے۔ یہ تمام چیزیں اس کے حدود میں

شامل ہیں۔ چنانچہ جب ہم اُن کے بارے میں گفتگو کریں گے تو ہمیشہ اسلامی حکومت، اسلامی فن وغیرہ کی اصطلاحیں استعمال کرینگے۔ یہ بات تو نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی صرف ایک ہی صورت ہے کیونکہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اسلام میں بڑی وسعت ہے۔ اس میں ہر شے اپنے اندر سمونے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کئی تغیرات آئے اور کئی باتیں شامل ہوئیں تاہم دنیائے اسلام میں ہر شے کا وجود ذاتِ باری کی تحمید و تمجید کے لئے ہے۔ چنانچہ گزشتہ صدیوں میں بادشاہوں کے تختے لٹے، ادارے انقلاب کا نشانہ بنے مگر اسلام بدستور باقی و قائم ہے۔ انسان کا مقصدِ حیات اطاعتِ الٰہی ہے، اور حکومت کا وجود اس لئے ہے کہ انسان کو اس مقصد کے قریب تر لائے۔ جو حکومت بھی نظامِ اسلامی کے سانچے میں اپنے اس فرض سے عہدہ برآ ہوتی ہے وہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہوگی اسی طرح فن بھی، قرونِ وسطیٰ کے مسیحی فن کی طرح اپنے وجود کے لئے اسی مقصد کا مرہونِ منت ہے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے شاید یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشتراکیت کی طرح اسلام بھی ایک بے لوچ اور سخت گیرانہ نظام ہے جو انسان کے اعمال بلکہ افکار پر بھی بڑی کڑی گرفت رکھتا ہے۔ عمومی اعتبار سے شاید یہ ایک حقیقت ہو لیکن اشتراکیت کے برعکس اسلام انسان کی خطا اور خامی کو ملحوظ رکھتا ہے اور اس میں اتنی وسیع النظری بھی موجود ہے کہ وہ ان کی نسبت رواداری برتے۔ مسلمانوں میں متعدد فرقے موجود ہیں اور ان میں انتہائی درجے کا اختلاف رائے موجود ہے اس لئے یہ گمان بھی گزر سکتا ہے کہ ہمارے بجائے دوسروں کا موقف ہی درست ہو۔ پس رواداری اسی بنا پر پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ بات اشتراکیت میں ممکن نہیں۔ کیونکہ اشتراکیت کا اثبات منطقی استدلال، اور اس کی کامیابی اس کی تقلیدِ کامل میں مضمر ہے۔ خدا اپنے بندوں کے ساتھ رواداری کر سکتا ہے، انسان نہیں۔ بہرحال اسلام اور اشتراکیت میں محض اتنی مماثلت ہے کہ دونوں کو وسعتِ نطاق[1] حاصل ہے اور دونوں کلیسا، ریاست یا دوسرے مغربی موسسات کی بہ نسبت اپنے پیروؤں سے زیادہ باتوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متخالف ہیں؟ اس سوال پر مشرقِ اوسط کے پس منظر اور موجودہ حالات کے تاریخی اسباب کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے۔

**اسلام اور ملت پرستی**

سرسری طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی میں دو قسم کی قومیت پرستی یورپ میں نمو پذیر ہوئی اور بعض اوقات یہ دونوں اقسام باہم گڈمڈ بھی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے ایک کی بنا تو فرانس کے قدیم نظریۂ ملت پرستی ــ "وطن" پر تھی۔ جس کی رُو سے عوام کو خواہ وہ کسی نسل، رنگ یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ریاست یا حکومت کے وفادار رہنے کی اس لئے تلقین کی جاتی تھی کہ یہ ریاست ان کی ریاست ہے اور یہ حکومت ان کی حکومت ہے۔ اگرچہ یہ عام خیال تھا کہ اس تصورِ ملت پرستی کی بنیاد عقلیت پر ہے اور یہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے عقائد و روایات کو باطل کرنے والی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میں چارلس پیگی (CHARLES PEGUY) کے نظریۂ "بسری جمہوری" (MYSTIQUE REPUBLICAINE) جیسے غیر عقلی عناصر شامل نہیں تھے۔ دوسری قسم کی ملت پرستی وہ تھی جسے خالص جرمن کہ

---

[1] BOTH ARE ALL-INCLUSIVE

سکتے ہیں یعنی DAS VOLK ۔ ملت اور جس میں خون اور نسل کو برتری دے کر انھیں ملت پرستی کی اساس قرار دیا گیا۔ ملت پرستی کا یہ تصور شرقی یورپ کے نسلی گروہوں کے لئے دل پسند ثابت ہوا جو انیسویں صدی میں اپنے آپ کو ایک قوم منوانے کی جدوجہد میں مصروف تھے جب اہل اروپا پر اس امر کا انکشاف ہوا کہ اُن کی زبان لاطینی کی ایک شاخ ہے اور اس باعث وہ اپنے سلاوی اور مجاری پڑوسیوں سے مختلف ہیں تو لازمی طور پر زبان، نسل اور خون کے تصورات سامنے آئے اور ملت پرستی کا نظریہ ابھرا۔ اہالیانِ ہنگری بلغاریہ اور دیگر ممالک میں بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ اتاترک کے عہد میں ترکوں کا رجحان طبع بھی فرانسیسی طرز کی نسبت جرمن طرز کی ملت پرستی کی طرف ہو گیا۔ چنانچہ کردوں، عربوں اور دوسری اقلیتوں کو ترکوں کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی گئی۔ یہ بات قدیم عثمانی تصورِ ریاست کے خلاف تھی۔

بہرحال عرب ترکوں کی تقلید نہ کر سکے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے ان کے علاوہ کسی اور نے یہ راستہ اختیار نہ کیا۔ اسلام عربی ملت پرستی کا ایک لازمی عنصر تھا[1] جو ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کی توسیعِ سلطنت کے ساتھ ظہور میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اسلامی ملت پرستی کا نام لیتے ہیں تو اس پر یورپ کی دونوں طرزہائے ملت پرستی میں سے کسی کا بھی اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے دنیائے عرب میں ایک انقلاب آچکا ہے اور مرجع اطاعت بدل چکے ہیں۔ عرب نوجوان اسلام کی ہمہ گیری سے بیزار ہو چکا ہے اور وزیر اعظم مصر سرکاری طور پر اس احساس کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ جمال عبدالناصر نے اپنے کتابچے "فلسفۂ انقلاب" میں تمام عربوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنی وفاداریاں متحدالمرکز دوائر میں منظم کریں۔ ان دوائر میں مصر کو قلب کی حیثیت حاصل ہے۔ وفاداری کے اگلے دائرے میں برعظم افریقہ آتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے نمبر پر عرب ریاستیں اور پھر دنیائے اسلام کی باری آتی ہے۔ اب یہ صورتِ حال اس سے برعکس ہے جو بیسویں صدی میں مشرقِ اوسط میں نظر آتی تھی۔ اس رجحان پر چین بجبیں ہونے سے کوئی فائدہ نہیں اور اسلام اس صورتِ حال سے اسی طرح مصالحت کی کوئی راہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس طرح قبل ازیں ترکی میں ہو چکا[2]۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب غالب انداز مختلف ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بہت سے پڑھے لکھے عرب نوجوان اس امر کا اعلان کر رہے ہیں کہ اسلام ترقی کے راستے میں روڑا ہے اور یہ ہر حال ختم ہو رہا ہے۔ ان کے خیال میں مغرب کی ساری ترقی اور اقتصادی نشوونما ملت پرستی کی مرہونِ منت ہے۔ لہٰذا عربوں کو بھی چاہیئے کہ ہر شے کو نظر انداز کر کے اپنی وفاداری ریاست کے ساتھ استوار کریں۔

ایران کا معاملہ مخصوص ہے۔ ایرانی اپنے ایک قدیم نظریۂ ملت کو سینے سے لگائے باقی دنیائے اسلام سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے ہیں۔ ایک براہِ راست مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایران اور باقی دنیائے اسلام کا تعلق وہی ہے جو مغربی یورپ میں کیتھولک لاطینی ممالک کا پروٹسٹنٹ ٹیوٹانی ممالک سے رہا ہے۔ اگرچہ بحیثیت مذہب اسلام کی وحدت، اسلامی

---

[1] یہ حقیقت نہیں (طلوعِ اسلام)

[2] قرآن کی رُو سے قومیت (ملت) کی بنیاد آئیڈیولوجی کے اشتراک پر ہے، اشتراکِ نسل و وطن پر نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

فن کی مذمت اور اسی قسم کی دوسری وحدتوں کے بارے میں ایک حد تک اعتماد کے ساتھ بات کی جا سکتی ہے لیکن یہاں اس جملے کا اضافہ ضروری ہے کہ مذہب اسلام کی ایرانی شاخ (یعنی شیعیت) یا ایرانی فن وغیرہ بھی اس میں شامل ہے۔ اگر غور سے دیکھیں تو ایک ایرانی کی نظر میں اسلام اور ایران متصادم نہیں۔ اس کے ذہن میں وہ ہم آہنگ ہو چکے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایرانی عناصر غالب ہوں گے اور بس۔ ثقافت۔ قدیم آرٹ اور ادبی روایات میں مہدی منتظر کے مذہبی عقیدے کی آمیزش اور پھر پوری تاریخ میں شہنشاہ کے مرکزی وجود کو تسلیم کرنا، یہ سب باتیں ایرانی ملت پرستی کی اساس ہیں[1]۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل ایران پر روس کا بڑا اثر تھا اور اس نے ایرانیوں پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ ایران سے مغرب کو جو راستہ جاتا ہے وہ روس سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس لئے اس ملک میں مغربی اثرات روسی چھلنی سے چھن کر پہنچے۔ رضا شاہ کے عہد میں ایران جدید نے ایسا کوئی تصور حیات پیش نہیں کیا جس کا موازنہ ترکی یا روس سے کیا جا سکے۔ دراصل یہ ایران کی ملت پرستی کا ثقافتی پہلو ہی تھا جس کے باعث ایرانیوں کے ہاتھ کوئی مثالیت بیچنا مشکل ہو گیا۔

دوسری طرف ترک بخوبی یورپی سانچے میں ڈھل گئے۔ قرون وسطیٰ کے اسلام کے بارے میں متعدد اہل قلم نے اس بات پر زور دیا ہے اور اس کی صداقت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روایتی طور پر عرب مذہب کے علمبردار تھے، ایرانی اسلامی فن کے اور ترک اسلامی حکومت کے۔ ترک کوئی ایک ہزار سال تک شرقِ اوسط پر حکومت کرتے رہے۔ چنانچہ وہ کاروبار سلطنت چلانے کے عادی اور اہل تھے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں حکومت کے مختلف تصورات پیش کئے اور سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد اتاترک کے مقلدین نے ایک نیا تصور "ترکیت" پیش کیا جو بہت حد تک جرمنوں کے خون و نسل پر مبنی نظریۂ وطنیت سے ملتا جلتا تھا۔ قدیم عثمانی سلطنت میں بہت سے ایسے عناصر تھے جنہیں روح کے اعتبار سے بمشکل ہی اسلامی کہا جا سکتا تھا۔ اسی لئے جب کمال اتاترک کی جماعت نے اسلام کو سیاست سے خارج کیا تو اسے اپنا مقصد پانے میں بہت معمولی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ درست ہے کہ ابھی تک دیہات میں رہنے والے اپنی مقامی روایات اور اپنے مذہب اسلام کا دامن چھوڑنے پر تیار نہیں تھے لیکن شہروں میں انتہائی سرگرمی کے ساتھ یہ تحریک چلائی گئی کہ "ترک" اور "مسلم" کا باہمی رشتہ منقطع ہو جائے۔ یہ کوشش کامیاب رہی اور آج ایک ترک کی وفاداری جداگانہ دائروں میں بٹی ہوئی ہے۔ مغرب کی طرح سیاست اور مذہب ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور ترک ایک ایسا تصور ملت پرستی اپنا چکے ہیں جس میں جنگ جو وطن پرستی کا عنصر کسی بھی مغربی ملت پرستی سے کم نہیں۔

آج مشرقِ اوسط کا حقیقی مسئلہ مغربیت اور روایتی اسلامی معاشرے کے مابین تصادم ہے۔ اس پیکار کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا جب مصر کے البانوی النسل حکمران اور سابق شاہ فاروق کے جد امجد محمد علی نے ملک پر مغربیت کا رنگ چڑھانا شروع کر دیا۔ اسلامی تاریخ کے بارے میں عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ چودھویں صدی سے انیسویں صدی تک مشرقِ اوسط پر مکمل جمود طاری تھا لیکن

---

[1] اور قرآن کے خلاف (طلوع اسلام)

تحقیق کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خیال صداقت پر مبنی نہیں۔ تاریخ کا اجمالی مطالعہ کرنے والے پر بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں ایک اہم ارتقاء رونما ہوا تھا۔ قریب قریب سولھویں صدی میں ایرانی شیعیت کی بنیاد رکھی گئی۔ سترھویں صدی میں مقبولِ عام درویشوں کی صحیح العقیدہ مسلمانوں سے مصالحت ہوئی۔ اٹھارھویں صدی میں اصلاحی تحریکیں منظرِ عام پر آئیں۔ مثال کے طور پر وہابیت کا نام لیا جا سکتا ہے جسے آجکل سعودی عرب میں اقتدار حاصل ہے۔ لہٰذا انیسویں صدی میں مغرب سے تصادم ہونے سے قبل وہاں عظیم انقلابات رونما ہو چکے تھے۔ یہ بات داخلی اسلامی تحریکوں کے لئے مستلزم تھی جن کا مغرب کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔

شروع شروع میں عربوں کو یقین تھا کہ مغرب کی کامیابی خالصتہً میکانکی ہے۔ چنانچہ انھوں نے سوچا کہ ان کی ترقی صنعت پر زور دینے میں مضمر ہے۔ گویا انھوں نے مغربیت کو اس امر کے مترادف سمجھ لیا کہ ملک کو میکانکی اور صنعتی بنا لیا جائے۔ جب مشرقِ اوسط کے کسی باشندے نے کوئی مشین یا فیکٹری درآمد کی اور اس سے حصولِ مقصد میں ناکامی ہوئی تو اسے اپنے پہلے مفروضے کے بارے میں شبہ پیدا ہونے لگا کہ کہیں مغربیت سے کچھ اور بھی تو مراد نہیں ہے۔ اب اس نے مغرب کی قوت کی بنیاد دولت پرستی کو قرار دے کر اس کی طرف رخ کیا۔ بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ دورِ حاضر میں کامیاب ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنے ماضی سے پوری طرح دست کش ہو کر مغرب میں پوری طرح جذب ہو جائیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغربیت سے آجکل مراد کیا لی جاتی ہے؟ اہلِ مشرق کو مغربی ثقافت کے بنیادی اصولوں کی تلاش میں کچھ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ اس سلسلہ میں اسے بہت کچھ مدد حاصل ہوئی ہے اس کی ایک بنیادی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ مغرب ماضی میں اور آج بھی اپنا تنقیدی جائزہ لینے کی منزل میں ہے۔

مغرب کی بعض علامات مشرقِ اوسط کے لوگوں کے لئے ذہنی خلجان کا باعث بنتی ہیں۔ جب مغرب کا کوئی باشندہ جمہوریت کا نام لیتا ہے تو عرب اس سے مساوات مراد لیتے ہیں۔ مشرقِ اوسط کے رہنے والوں نے درحقیقت ایک ایک جماعتی معاشرے میں نشوونما پائی ہے۔ اس لئے ان کی نظروں میں جمہوریت کے اولین اصولِ حریت کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اشتراکیوں کی طرح ان کے نزدیک بھی آزادی کا یہ مطلب تھا کہ کسی نظام کے عائد کردہ اصولوں کی پابندی سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں انھیں جس نظام سے واسطہ پڑ رہا ہے وہ اسلام تھا۔ اس طرح جمہوریت نے مشرقِ اوسط کے بہت سے لوگوں کے لئے ایک نعرے کی صورت اختیار کر لی جس کا مطلب تھا۔ مساوات، پوشیدہ رائے دہی اور اقتصادی ہمسری۔ لیکن ان باتوں سے حصولِ مقصد میں کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ مغرب سے چند ہتھکنڈے تو سیکھے جا سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی قدیم ثقافت کے بنیادی سانچوں کو برقرار رکھا جا سکتا ہے اور اسے برقرار رکھنا بھی چاہیئے۔ مغرب کے مقابلے میں اپنے ثقافتی سانچوں کی برتری نے ان کے اندر ایک اعتماد اور گرم جوشی پیدا کر دی جس سے اس احساسِ کمتری میں کمی واقع ہو گئی جو یورپ کی شینوں کے باعث ان کے دل میں موجود تھا۔ چنانچہ دورِ حاضر کے مشرق نے یہ نعرۂ جنگ اختیار کیا کہ بھاری صنعتوں کو فوقیت دی جائے لیکن ثقافتی انفرادیت کو برقرار رکھا جائے۔

یہی وہ چیز ہے جو تمام اہلِ مشرق کا مقصد بن چکی ہے یعنی ایک طرف تو صنعتی ترقی کے میدان میں مغرب کے ہم پایہ ہو جائیں اور دوسری طرف اپنی سقای ثقافت کو باقی و قائم رکھیں۔ اول الذکر مقصد کے حصول کے لئے انھیں خارجی امداد درکار ہے اور موجودہ

حالت کے پیشِ نظر روسی ہی اُن کی زیادہ سے زیادہ مدد کر سکتے ہیں۔

## اشتراکیت اور اسلام

سوویت پروپیگنڈے کی کامیابی کا اندازہ ان دوروں سے لگایا جا سکتا ہے جو مصر، شام اور مشرقِ اوسط کے دیگر ممالک کے وفود نے سوویت وسطِ ایشیا میں کئے ہیں۔ اگرچہ ریاستہائے جمہوریہ اشتراکیہ روس میں مشرقی سیاحوں کے لئے تاشقند اور وسط ایشیا کے کئی دوسرے شہروں کو قابلِ دید مقامات کی حیثیت حاصل ہے۔ گو اہلِ مغرب شاید ان میں سے کسی مقام کی سیر کو ابدی قرار نہ دیں۔ سیاح یہاں پہنچ کر مقامی لباس دیکھتا ہے۔ ریڈیو پر اور مدارس میں مقامی زبانیں سنتا ہے کھلی مساجد دیکھ سکتا ہے۔ مختصر یہ دیکھتا ہے کہ یہاں مقامی ثقافت کو اپنی بقا کے لئے عملی ضمانت حاصل ہے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اسے برقابی عظیم الشان مشینوں، انجن کے کارخانوں، ہسپتالوں اور اسی قسم کے دوسرے اداروں کی سیر کرائی جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ثقافتی خود مختاری اور بھاری مشینوں کی صنعتیں ہی وہ مثالی طرزِ عمل ہے جسے اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ اس سلسلہ میں چند انفرادی قربانیاں دینی پڑتی ہیں لیکن ذرا اس کے نتیجے پر تو نظر ڈالئے۔ آپ کس تیزی سے اپنے ملک کو صنعتی ترقی سے ہمکنار کر کے مغرب کے دوش بدوش چل سکتے ہیں۔ اہلِ مشرق ان باتوں سے بےحد متاثر ہوتے ہیں اور سوویت یونین کے گن گاتے اور اپنے وطن کو لوٹتے ہیں۔ یہ سب کچھ حقیقۃً ہو رہا ہے۔ خیالی بات نہیں ہے۔

سوویت حکومت مشرق کے سامنے ایک قابلِ تقلید نمونہ پیش نہیں کرتی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ امریکی امداد کے منصوبوں اور کوششوں کا مضحکہ اڑاتی ہے۔ نکتۂ چہارم سے تو صرف چھوٹی ملوں کے لئے روپیہ مہیا ہو سکتا ہے۔ بھاری صنعتیں نہیں جن کی مشرق کو ضرورت ہے۔ اشتراکی اس امر کی جانب توجہ دلانے میں بھی پس و پیش سے کام نہیں لیتے کہ مغربی ممالک کے بینکوں والے اور حکومتیں مشرقِ اوسط کی بھاری صنعتوں میں کبھی سرمایہ نہیں لگائیں گی اور اس سلسلہ میں انہیں پروپیگنڈے کے جو امکانات نظر آتے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ظاہر ہے کہ مادی اعتبار سے مغرب کو بے انتہا مشکلات کا سامنا ہے بالخصوص اس لئے بھی کہ خیرات کے ذریعہ اُن لوگوں کو سچا دوست نہیں بنایا جا سکتا جو نادار ہوں۔

جہاں تک اس سے شاید زیادہ اہم مثالی سطح کا تعلق ہے۔ مغرب کی حالت اور بھی ابتر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اشتراکیوں کے پاس ایک فلسفہ ہے۔ ایک کشش اتصال ہے اور ایک ایسی عملی منصوبہ بندی ہے جس کا مغرب میں فقدان نظر آتا ہے مشرق میں یورپی سامراج کی تلخ یادیں بھی ایک دوسرے کو سمجھنے کے سلسلہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہیں۔ مگر اس مسئلہ میں ایک دوسرے کو سمجھنا کلیدی حیثیت رکھتا ہے حالانکہ اہلِ مغرب اہلِ مشرق کو سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے۔ آخری تجزیے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کامیابی کی واحد صورت باہمی اشتراک و اعتماد میں مضمر ہے اور اس کی بنیاد چارلس ملک کے الفاظ میں یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ ایک دوسرے کا احترام کیا جائے جو بالآخر محبت کی صورت اختیار کر لے۔

مشرقِ اوسط اور مغرب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور یہی مشترکہ روح اُن کے باہمی اتحاد کی اساس بننی چاہیئے۔ اشتراکی روس کے پاس مشکلات سے نجات دلانے کی ایک مکمل تجویز موجود ہے جس کی رُو سے دنیا کے حقیقت میں معاشرے یا ریاست کو

فرد کے مقابلے میں ایک بلند تر سطح حاصل ہو جاتی ہے۔ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی روایات کے معاشری اور قانونی پہلوؤں سے قطع نظر ان تینوں عظیم مذاہب میں انفرادی روح ہی کو اہمیت دی گئی ہے۔ اگر اشتراکیت اور مسیحیت متبائن ہیں تو اسلام اور اشتراکیت میں بھی کوئی ہم آہنگی نہیں۔ اپنی بے سابقہ سرگرمی اور معنویت کے باوصف اشتراکیت میں دو بنیادی خامیاں موجود ہیں۔ اول یہ نظام واقعی طور پر چل نہیں سکتا۔ منطقی تناقض اور عملی مشکلات کے باعث اس کی عمارت زمین پر آ رہتی ہے۔ دوم۔ ان کے ہاں اعتقاد میں ایک قسم کی نخوت پائی جاتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے حقوق غصب کر کے انسان کے حوالے کر دیئے ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات نظر آتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح انھوں نے انسان کو ان حیوانوں کے درجے پر پہنچایا ہے جن پر پاولوف (PAVLOV) اپنے تجربات کیا کرتا تھا۔ ہٹلر کی ہزار سالہ سلطنت (REICH) کی طرح اشتراکی نظام بھی شاید اتنا مستحکم نہیں جتنا نظر آتا ہے لیکن جہاں تک موجودہ حالات کا تعلق ہے۔ اشتراکیت کو روز بروز فروغ حاصل ہو رہا ہے اور یہ مغرب کے لئے ایک زبردست دعوتِ جنگ بن گئی ہے۔

میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام مشرق اوسط میں اشتراکیت کا سدباب کر دے گا البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ صرف اسلام ہی اس کا سدباب کر سکتا ہے۔ تمام اقتصادی اور عسکری امداد، جمہوریت کے بلّے میں یہ ساری باتیں، دعوے اور دھمکیاں — ان کے ذریعہ مشرق اوسط کو بچا نا ممکن نہیں۔ اس علاقے کے لوگ خود ہی اپنی اسلامی تہذیب کے ذریعہ یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں کیونکہ یہ تہذیب شاندار بھی ہے اور قابلِ توانق بھی۔ انھیں اپنی نجات کا راستہ خود تلاش کرنا ہوگا۔ اشتراکیت اور مغرب دونوں اسے یہ راہ سمجھانے سے قاصر ہیں۔

---

**طلوع اسلام**:- کس قدر صحیح ہے یہ کہنا کہ ملت اسلامیہ کو اپنی نجات کا راستہ خود تلاش کرنا ہوگا۔ اشتراکیت اور مغربی تہذیب دونوں اسے یہ راہ سمجھانے سے قاصر ہیں اور یہ راستہ قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ مختلف اسلامی ممالک میں تجدد پسندی (جو درحقیقت ملّا کے پیش کردہ مذہب کے خلاف ردعمل ہے) کچھ ہی کیوں نہ کہے مسلمان کو بالآخر قرآن کی طرف آنا ہوگا۔ اس کے سوا ان کے لئے نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں۔


## ضرورت ہے

ادارۂ طلوع اسلام کو مقام حدیث (جلد اول و دوم) کی ضرورت ہے۔ جو صاحب اسے فروخت کرنا چاہیں دونوں جلدیں ناظم ادارہ کے نام بھیج دیں۔ قیمت مع خرچ ڈاک بذریعہ منی آرڈر بھیجدی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

مذاکرہ عالم اسلامی۔ لاہور

# مسلمان کی پہچان کے اصول

از ڈاکٹر فان گرون باؤم پروفیسر کیلیفورنیا یونیورسٹی۔ (امریکہ)

قرون وسطیٰ کے مغرب کی ثقافت کی بنیاد ازمنۂ قدیم کی وراثت عیسائیت اور جرمنوں کی روایات کے باہمی عمل و امتزاج پر رکھی گئی تھی اور اگر کوئی شخص قرون وسطیٰ کی مسلم ثقافت کو اسی اصول کے تحت جانچنے کی کوشش کرے گا تو اس کی بنیاد عربی وراثت، اسلام اور اس کے مفتوحہ علاقوں کی روایات کے باہمی اختلاط و امتزاج پر رکھے گا

جرمن قبائل و اقوام کی یک رنگی کا اگر ان مختلف و متضاد روایات سے مقابلہ کیا جائے جن سے عربوں کو اور اسلام سے واسطہ پڑا تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرون وسطیٰ کی اسلامی دنیا میں ہندوستان سے لے کر اندلس تک رنگا رنگ کے کثیر التعداد ثقافتی اظہار کیوں ظہور پذیر ہوئے۔ حالانکہ ان ادوار کی مغربی ثقافت یک رنگ اور ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

سائنس، حریت پسندی اور قومیت کے متحدہ محرکات (اور وہ ترقی جو ان کے امتزاج سے پیدا ہوئی) کے زیر اثر مغرب کی تعمیر نو نے مسلم ثقافت میں ایک اور عنصر کا اضافہ کیا (جیسا کہ مشرق و افریقہ کی تمام تہذیبوں نے اس نئے عنصر کو اپنایا) اور یہ جزو یا عنصر جدید مغرب سے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ بادی النظر میں یہ ردعمل دنیائے اسلام کے ان ثقافتی اختلافات کو نظر انداز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جن کی حیثیت بعض مسلم اقوام میں تاریخی نوعیت کی ہے اگرچہ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ مقامی ردعمل کے نتائج عموماً عناصر کی ممتاز خصوصیت کی تحکیم و توثیق کی صورت میں ظاہر ہونے کا رجحان رکھتے ہیں جو آج کل کئی علاقوں میں قومیت پر مبنی ریاستوں کی شکل میں پیدا ہو چکے ہیں۔ لہٰذا مغربی ثقافت کے ساتھ رابطہ پیدا کرتے وقت انہیں خود شناسی کے اس احساس کو بھی قائم و برقرار رکھنا ہے جو مغرب ہی کے رابطے سے ان میں پیدا ہوا ہے۔

## مسلمان کی شناخت

اس تجزیے میں مسلمانوں کے اتحاد کے بجائے ان کے اختلافات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ شناخت یا پہچان سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلم ثقافت و تہذیب کے تصور یا اس کے مادی عناصر ترکیبی کا جائزہ لیا جائے۔ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ ایک فرد مسلم کن اوصاف کی بنا پر اپنے آپ کو مسلمان اور اسلامی تہذیب کا علمبردار سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ میں مسلم و عیسائی جامعیت کا مقابلہ کر کے دونوں کے ایک بنیادی اور اہم

اختلافات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ ثقافت و مذہب کی بنا پر اتحاد کا جو تجزیہ میں کرنا چاہتا ہوں اس میں عقیدہ کے ادعا اور تہذیب کی ماہیت دونوں کی جانچ شامل ہے۔ اگرچہ سہولت بیان کی غرض سے ثقافت و مذہب کا ذکر الگ الگ کیا جا سکتا ہے لیکن حق تو یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کی ہمیشہ سے یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ وہ مقامی تہذیب کے نمایاں عناصر کو اپنے مذہبی اعمال کے مقابلے میں یا سارے طریقِ زندگی میں حقیر سمجھیں یا ثانوی حیثیت دیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہبی جوش اور قرآن و سنت پر مبنی معاشرتی فقہی نظام سے پوری پوری مطابقت ہر جگہ اور ہر صورت میں نہیں ہو سکتی لیکن اسے جہالت، کمزوری اور نسلی یا معاشرتی کوتاہی پر مبنی خیال کر لیا جاتا ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ اتحادِ اسلامی کو محفوظ رکھنے کا موثر ترین طریقہ یہی تھا کہ جو چیز معیاری دینی ثقافتی عمل سے ہٹی ہوئی ہو اسے رد کیا جائے تاکہ اس عالمگیر مسلم اتحاد میں ہر فرد، خواہ اس میں مستند تصور کی رو سے کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں اپنے آپ کو محفوظ اور مضبوط محسوس کر سکے۔ اس اعتبار سے مقامی زبانوں کے مقابلے میں عربی کو ذریعۂ تعلیم بنانا بھی تعمیرِ ملی کا اہم ستون ہے۔ بنابریں نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کی حیثیت سے پہچانے کا اس چیز سے کوئی تعلق نہیں کہ تاریخی و سماجی اعتبار سے وہ کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اس کا تعلق منینگ کباؤ (MENANGKABAU) کے مادری وراثت کا معاشرتی نظام رکھنے والے قبیلے سے ہے تو یہ چیز اسے اپنے آپ کو مسلمان بلکہ اچھا مسلمان سمجھنے سے مانع نہیں آ سکتی اور نہ کسی وہابی کو مسلمان ہونے کے احساس سے روک سکتی ہے۔ اور نہ اس وقت روکنے کا موجب بنی جب عالمِ اسلام کی اکثریت وہابیوں کو اہلِ سنت والجماعت کے حلقہ میں شمار کرنے سے بہت متامل تھی۔ اور نہ ایک گاؤں کا فرد یہ جاننے کے باوجود کہ دوسرے گاؤں کی رسوم اس سے مختلف اور اس کے لئے ناپسندیدہ ہیں اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کو امتِ مسلمہ کے دائرے سے خارج خیال کر سکتا ہے۔

ایک مصری مسلمان (جیسا کہ ایک غیر ملکی ڈگری یافتہ اور ترقی پسند پروفیسر نے مجھے بتایا) اپنے آپ کو اپنے قدیم عیسائی ہم وطن سے چین کے مسلمان کے زیادہ قریب پاتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ ایک جزدی[1] حقیقت ہے لیکن یہ حقیقت ایک نظریہ ایک خواہش یا ایک معیار کو پیش کرتی ہے اور یہ اس وقت موثر ثابت ہوتی ہے جب مصر و چین کے اسلام کی اہم حقیقتوں کے مقابلے میں تصور کی حقیقت کا احساس قوی تر ہو۔ ہر عمل اندرونی جذبے کا غماز ہوا کرتا ہے۔ مسلمان کا ہر عمل روزمرّہ کے لئے اس معیاری جذبے کا تابع ہے اور ہر خیال و عمل کو اسی نظر سے صحیح یا غلط قرار دیتا ہے۔

کسی گروہ یا سوسائٹی میں اتفاقی پیدائش جس میں ایک فرد اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتا ہے۔ اس کے جذبات کا تعین کرتی ہے اور وہ اسی جذبے اور فہم کے مطابق ایک چیز کو اسلامی سمجھ کر اس پر عمل کرتا ہے۔ حالانکہ بعض دوسرے گروہ اس سے اختلاف رکھتے ہیں اور وہ اسپنے طرزِ عمل کو بھی اسلامی سمجھتے ہیں۔ (مثلاً نکاح کی رسوم، خونبہا کے قواعد)۔ اسلام ان دونوں عمل

---

[1] یہ جزدی حقیقت نہیں۔ اسلام کا اصل اصول۔ یہی جسد پر تشکیلِ امت کا مدار ہے۔ (طلوعِ اسلام)

نقشوں سے الگ اور وراء الوراء ہے[1]

یہ بڑے گروہ یا طبقہ پر لازم ہے کہ وہ چھوٹے گروہ کو اس کے اپنے طریق و انداز فکر کے باوجود اپنے مذہب سے اس لئے جدا نہ کرے کہ اس کا اپنا انداز فکر و طریق زندگی اس سے جداگانہ ہے۔ اور یہ چھوٹے گروہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ مختلف طریق زندگی اپنائے ہوئے بھی سواد اعظم میں شامل رہنے کی خواہش رکھے۔ مسلمان ہونے کی مختصر سی پہچان یہ ہے کہ وہ ایک خدا کو مانے اور اس کے رسول محمد عربی کو آخر الزماں نبی تصور کرے۔ چند بنیادی اعمال کو ادا کرے اور جن چیزوں پر اعتقاد نہیں رکھتا یا ایسا نہیں کرتا ان کو کافر کہے (لیکن یہ آخری شرط دیر تک قائم نہ رہ سکی) اور یہ اصول کچھ زیادہ نہیں ہیں کہ الجھن پیدا کریں۔ البتہ حلال و حرام کا مسئلہ ان میں اہم ہے۔ لیکن ان کے تعین پر اکثریت متفق ہے۔ اور وہ اس کا فیصلہ تاریخی و ثقافتی فیصلوں کی پابندی میں کرتے ہیں[2]۔ اس کے علاوہ ہر جگہ غیر مسلم آباد ہیں جو اپنے تضاد سے مسلمان ہونے کی حدیں معین کر دیتے ہیں اور بتا دیتے ہیں کہ کون سی بات اسلامی ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ کے چند جلنے پہچانے احکام و اعمال خواہ وہ صحیح روایات پر مبنی نہ بھی ہوں۔ مسلمان کی شناخت کے لئے کھلی علامت ہیں۔ ان احکام و اعمال کا یہ کام نہیں کہ اسلام کی حقیقت کی گتھیاں سلجھائیں بلکہ وہ تو دینی معاشرتی وحدت کی علامات ہیں اور یہ چیز اعتقاد سے مختلف ہے۔ یہ عقائد و اعمال امت مسلمہ کو استواری اور دوامی نظام کی حیثیت بخشتے ہیں۔ اور یہ وقتی عناصر قطعی اور دائمی عناصر کو کمزور کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تاکہ نیم مسلمان بھی پکے مسلمانوں کی صف میں کھڑے ہو سکیں[3]۔

اجتماعی بنیادوں پر امت سے منسلک رہنے کا ہر دلعزیز اصول امت کو (جو فطرتاً غیر منقسم ہے) اس عالمگیر مشن کے لئے ہر وقت تیار رہنے کے قابل بناتی ہے جس کو وہ صدیوں سے سرانجام دے رہی ہے۔ اس چیز نے اسلام کو آزاد و فراخدلانہ بھائی چلنے کا اصول عطا کیا۔ اسلام میں داخل ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ سوسائٹی یا ایک فرد اس کے تمام عقائد و طریق زندگی (جو اس کے مقاصد کا تعین کرتی ہے) کماحقہٗ واقفیت رکھتا ہو۔ مسلمان بننے کے لئے صرف اس رضامند اقدام کی ضرورت ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اپنی رضا سے اس میں شامل ہو جائے۔ اس اقدام سے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اس نئے مذہب میں شامل کر جاتا ہے۔

ارتداد کو بہت برا خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ عقائد سے انحراف ہی نہیں بلکہ اسے امت سے غداری بھی تصور کیا جاتا ہے۔ اور جب وہ دوبارہ مسلمان ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنے نظریات پر نظر ثانی کے لئے نہیں کہا جاتا بلکہ اسے مسلم سوسائٹی کا ممبر

---

[1] قرآن کے اصول ہر جگہ ایک ہونگے۔ ان کے تابع مختلف مقامات میں تقاریب اور رسوم مختلف ہو سکتی ہیں۔ (طلوع اسلام)

[2] غور کیجئے کہ اسلامک آئیڈیلوجی میں عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت کو اس غیر مسلم نے کس عمدگی سے سمجھا ہے (طلوع اسلام)

[3] حرام و حلال کا تعین خود قرآن نے کر دیا ہے (طلوع اسلام)

[4] یہاں بات صاف نہیں ہوئی۔ (طلوع اسلام)

بننے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنی رضامندی کے عمل سے امت مسلمہ کے دائرے میں دوبارہ شامل ہو جائے۔ اسلام لانے کو عموماً اس فیصلے کا ابتدائی قدم سمجھا جاتا تھا کہ وہ قرآن پاک سے ذاتی واقفیت حاصل کرنے کا خواہاں ہے۔ (اس معاملے میں اسلام اور عیسائیت کے مطمح نظر اور ان کی توقعات کا فرق نمایاں اور نمایاں ہے)۔

اسلام میں داخل ہونے کے لئے توحید و نبوت پر اعتقاد کے علاوہ دیگر معتقدات کی وضاحت ضروری نہیں۔ البتہ مسلمان بننے کے ساتھ ہی یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ مسلمان ہونے والے کو ایسی زندگی پانے کی امید ہے جس کی رہنمائی اللہ کی طرف سے ہوگی اور جب ہم اس امت میں ثقافتی تضاد و اختلاف پاتے ہیں تو یہ بات شرط لازم بن کر سامنے آجاتی ہے اور اگر صرف چند مختصر عقائد ہی مسلمان بننے کے لئے کافی ہوں تو یہ چیز ان لوگوں میں بھائی چارے کا احساس پیدا کرتی ہے، جو عام طرز زندگی و انداز فکر میں یکسانیت کی چیزیں کم رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ صرف ثقافتی سطح پر ایک دوسرے سے ملتے اور جانچتے تو یقیناً ایک دوسرے کو نفرت و شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ یہ اصول ان عالمگیر اقدار کو جنم دیتا ہے۔ اور رائج کرتا ہے۔ جنہیں قومی دھڑے بندیاں یقیناً نیست و نابود کر دیتیں۔

شناخت کا یہ سیدھا سادا طریقہ ان عوامل میں سے ایک ہے جنہوں نے ماضی و ماضی قریب میں مسلم ثقافت کو پھیلانے میں مدد دی۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں اسلام نے اس وجہ سے بھی ترقی حاصل کی کہ ایشیا اور افریقہ کے عوام کا خیال تھا کہ عیسائیت ان کے حاکموں یا ہونے والے حاکموں ..... کا مذہب ہے اور مسلمانوں سے اتحاد کا صرف یہ مطلب ہوگا کہ وہ سچائی کے راستے پر گامزن ہو جائیں گے بلکہ سیاسی ترقی بھی کریں گے۔ اور پھر عالمگیر برادری میں شامل ہو کر اسلام کے روحانی ذرائع انہیں مغربی عیسائیت کا بے دام غلام بننے سے بچا لیں گے۔ یہ مخالفت عیسائیت کے عالمگیر پیغام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ تھی لیکن خواہ وہ غلطی پر ہی تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ عیسائیت میں شامل ہونے کے لئے پابندیوں اور مشکلات کی وجہ سے عیسائیت پچھلے دو سو سال میں اتنی موثر ثابت نہیں ہوئی جتنا ثقافتی میدان میں اسلام ثابت ہوا ہے۔ عیسائیت مغربی ثقافت کی ترقی کے لئے مستعد رہی ہے (حالانکہ یہ اس کی تعلیم سے انحراف و مخالفت کا نتیجہ تھی) غیر مغربی علاقوں پر اس کا تصرف یا تو عرف وسطی و جنوبی امریکہ تک ہے کیونکہ انہیں کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آتا تھا یا جہاں مقامی طور پر اس کا بندوبست کیا گیا کہ مقامی روایات و رسوم کو بھی زندہ رکھا جائے خواہ کچھ بھی ہو لیکن جب تک عیسائی طبقوں میں منافرت پائی جاتی ہے جو صرف مختلف عیسائی تہذیبوں (یعنی رومن و بازنطینی) کے جائز وارث ہونے کے زعم کی وجہ سے ہے۔ اس وقت تک عیسائیت آزاد سیاسی و سماجی طبقہ پیدا نہیں کر سکتی جب تک صرف داخل ہونے کی خواہش ہی اسے اس حلقہ میں شمولیت کا حق نہ دلا دے اور انہیں اس بات کا علم نہ ہو جائے کہ انہیں عیسائی معاشرہ میں داخل کر لیا گیا ہے۔

مختصر الفاظ میں اس کا دوبارہ تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کے اتحاد کا انحصار اسلام کی طرح چند سیدھے سادے عقائد پر نہیں بلکہ (LEBENSGEFUHL)[1] پر ہے۔

---

[1] احساس زندگی یا شعور حیات

یہ (LEBENSGEFUHL) مغربی انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ فرض کرے کہ اس کے ذمے کئی اہم فرائض ہیں اور اسے ان کی لامحدودیت کے بارے میں سوچے بغیر انھیں سرگرمی سے بجالانا ہے۔ نئی اصطلاح میں ہم اسے جہد للبقا کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ دنیا جو فعلی صفات کے تحت اسباب و نتائج کی دنیا ہے، ہم اس کی مثالوں سے اس کی بقا کا راز سمجھ سکتے ہیں اور اپنے علم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ تفہیم یا دنیا کا عمل جسے عقل وضع کرتی ہے اور انسانی کارنامے اس کی قطعیت و تکمیل کو پانے کی کوشش میں اپنے آپ کو ختم کر دیتے ہیں کیونکہ وہ عقل کی طرح اس کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ اس کا ماخذ جو کچھ بھی ہو مغرب والوں کو اپنے ہر سماج سے متاثر جذبے اور نظریے کو اس (LEBENSGEFUHL) کا پروردہ ثابت کرنا پڑتا ہے۔ یہ (LEBENSGEFUHL) ہی اس کے اتحاد کا ضامن ہے۔ اس کے عقائد و تنظیم کے سرگرم عناصر اسے مسترد نہیں کرتے اور یہی وجہ ہے کہ مغربی کردار کی صفات دوسرے ممالک کے لوگوں میں نہیں پھیلیں۔

نتیجۃً مسلم امت کا ڈھانچہ اُن لوگوں سے بنا ہے جو صرف خواہش ظاہر کر کے مسلمان بن سکتے ہیں۔ وہ قومی، نسلی اور ثقافتی اختلاف، حکومت کے غرور، غلامی کی ذلت اور کسی حد تک طبقاتی شعور کے باوجود ایک قومیت کا احساس رکھتے ہیں اور یہ اختلافات انھیں ایک ہو جانے میں مدد دیتے ہیں۔ ترک۔ ترکی ملت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ایک مقام اور تنظیم کا مالک ہے۔ اس کی زبان اور تاریخ معین طور پر الگ ہے۔ اور اس کی سیاسی و ثقافتی آرزوئیں اسلامی تہذیب کے روایتی دائرے میں دوسرے گروہوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ترکوں نے اعلان کیا ہے کہ ان کی حکومت غیر مذہبی ہے سیاسی اعتبار سے مذہب کو بے اثر مانا گیا ہے۔ ایک ترک شہری کے مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے، لیکن ترک، ترکی شہری ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حق خود شناسی کے اعتبار سے مسلم امت کا ایک رکن ہے۔ بعض صورتوں میں وہ اسلام کے اصولوں سے ناواقف بھی ہوتا ہے۔ عبادت بھی نہیں بجالاتا، ارکان مذہب کا پابند بھی نہیں ہوتا اور سماجی زندگی میں غیر مسلموں کی مساوی شرکت بھی برداشت کرتا ہے، لیکن اس کے لئے اس کی خود شناسی ایک اہم اور قابل فخر عنصر ہے کہ مندرجہ بالا تمام باتوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک ایسی جماعت سے منسوب رکھتا ہے جس کے بہت سے آثار و احکام کو بھی وہ قدامت پر مبنی سمجھتا ہے۔ گویا اس مرضی اس کی شناخت میں ایک بہترین اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ مکمل ترک ہونے کے لئے مسلمان ہونا لازمی ہے۔ اگرچہ دوسرے مذہب کا پیرو ہونے کی صورت میں شہری حقوق پر زد نہیں پڑتی۔ چند قدرے متعصب بلکہ کٹر مسلمانوں نے دوسری سوسائٹیوں میں آزادی حاصل کرنے کے بعد چند ہی سال میں قومی اتحاد کی خاطر مذہب کو بہت فروغ دیا ہے خواہ حکومت کا نقطۂ نظر اس کے متعلق کچھ بھی ہو۔ اس مضمون میں آزادی کا مطلب (دوسری چیزوں کے علاوہ) اعلیٰ شعور سے کھلم کھلا روحانی اقدار کی طرف مراجعت ہے۔ جو غیر ملکی حکومت کے یا شاہنشاہی دور میں خود آگاہی، روایتی، رجعتی اور پرانی تہذیبی و سیاسی ترقی کے لئے ناموزوں خیال کی جاتی تھی۔ ملکی اور بلند حکومت کے دنوں میں یہ بات پرانی ہو چکی ہے غیر ترقی یافتہ اور نامناسب پچھلی صدی میں مقابلے پر آنے سے ان مغربی عیسائی ممالک کی ترقی کے بارے میں کوئی فیصلہ

نہیں کیا جاسکتا۔ جنھوں نے اپنی شناخت کے لئے قومیت کو اپنایا۔ اگرچہ یونان و پولینڈ کسی حد تک مذہب کی وجہ سے پہچانے گئے۔ آسٹریلیا کے پروٹیسٹنٹ اور انگلستان کے کیتھولک اپنی قومیت سے نہیں نکالے جاسکتے خواہ وہ کتنے ہی کٹر مذہبی کیوں نہ ہوں۔ اس بات کا ان کے آسٹریلین یا انگریز ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی حالت شاید اس شخص کی سی ہے جو سماجی طور پر غلط گروہ سے متعلق ہو جائے۔

آجکل مسلم ہونے کی شناخت کا اصول موثر ہونے کے بارے میں شاید اس سے عمدہ مثال اور کوئی نہیں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں پاکستانیوں، عربوں اور ترکوں کے ذاتی خیال کو پیش کر کے دی جاسکتی ہے۔ اس چیز کے علاوہ جو ہم نے کبھی اختصار و خواہش کے عناصر ہی ان مختلف افراد اور سوسائٹیوں کے اتحاد کا عنصر ہیں جن کی ہیئت روایات اور دینی نظریات اتنے مختلف ہیں کہ اگر یہ اتحاد سماجی بنیادوں پر ہوتا تو ہرگز ممکن نہ ہوتا۔

یہ صرف اس فیصلے کی وجہ سے ہے کہ وہ ان میں اپنے آپ کو شریک کرنا چاہتا ہے جن کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ ان بنیادی اہم عناصر سے بے خبر ہے جو اسلامی روح نے اس امت میں رائج کر رکھے ہیں۔ پس چونکہ وہ اتفاقاً مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا ہے اس لئے اسی امت کے فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہے۔


# من و یزداں (پمفلٹ)

خدا کے صحیح تصور اور خدا اور انسان کے باہمی تعلق کو سمجھانے کیلئے اس سے بہتر طریق کوئی نہیں ہو سکتا کہ آپ اس پمفلٹ کو خود بھی پڑھیں اور دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ قیمت ۳ر

ناظم ادارہ طلوع اسلام

25/B ــــ گل برگ ــــ لاہور

# رابطۂ باہمی

## نمائندگان کا اجتماع

۴ر اکتوبر کو (جیسا کہ اعلان ہو چکا ہے) بزمہائے طلوع اسلام کا ہمارے سالانہ اجتماع ہو رہا ہے۔ اس کے لئے بعض بزموں نے لکھا کہ ان کے ہاں سے نمائندۂ بزم کے علاوہ کچھ اور احباب بھی شریک اجتماع ہونا چاہتے ہیں۔ چونکہ یہ صرف نمائندگان کا اجتماع ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں نمائندگان کے علاوہ کسی اور صاحب کی شرکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم نے ان بزموں سے معذرت چاہی ہے اور اجتماع میں شریک ہونے والے نمائندوں کے نام (متعلقہ بزم کی وساطت سے) دعوت نامے اور ضروری ہدایات بھیجدی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ، کوئی اور صاحب اجتماع میں شرکت کی غرض سے تشریف لانے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اجتماع ۴ر اکتوبر (ہفتہ) کو صبح دس بجے، ادارۂ طلوع اسلام میں منعقد ہوگا۔ دوسرے دن (اتوار کی صبح) پرویز صاحب کے درسِ قرآن کے بعد (جو دس بجے ختم ہو جاتا ہے) نمائندگان رخصت ہو جائیں گے۔ اجتماع کی کارروائی آیندہ ماہ طلوع اسلام میں شائع ہوگی۔ واللہ المستعان۔

---

## مختصر روئیداد بزمہائے طلوعِ اسلام

**۱- مظفر گڑھ** تقریب عید میلاد النبیؐ، "مقام محمدیؐ" کا پمفلٹ پڑھے لکھے اور باشعور طبقہ میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ، اور پمفلٹ بھی۔

**۲- کراچی** بزم کے اجتماعات میں طے پایا کہ (۱) گھروں میں قرآنی فکر کے فروغ کے لئے "اسلامی معاشرت" کا مطالعہ کرایا جائے۔ (۲) عام نشر و اشاعت کے لئے (ادارہ کی اجازت سے) "روٹی کا مسئلہ" اور "قرآن نے

کیا کہا" ہزارہا کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کئے جائیں۔ بزم کے زیر اہتمام دار المطالعہ عمدگی سے کام کر رہے ہیں۔ شہر میں مرکزی دفتر اور لائبریری کے قیام کے لئے جدوجہد جاری ہے۔

(۲) محترم ملام صاحب خرابیٔ صحت و مصروفیات کی وجہ سے نمایندگی سے سبکدوش ہو گئے۔ ان کی جگہ میاں عبدالخالق کو نمایندہ منتخب کیا گیا۔

**۳۔ قصور** یہ شہر سرمایہ داری اور قدامت پرستی کا گڑھ ہے، اس لئے اس میں قرآن کی آواز کا آگے بڑھانا جوئے شیر کا لانا ہے۔ باایں ہمہ، بزم کے سادہ اور مختصر سے اجتماعات میں، مشکلات پر قابو پانے کی تدابیر پر غور کیا جاتا ہے۔ وبیدہ التوفیق۔

**۴۔ شیخوپورہ** قرآنی فکر کے عام کرنے کے لئے پمفلٹوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری ہے۔

**۵۔ سید حسن ضلع جہلم** عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید پر "مقام محمدیؐ" اور "من ویزداں" کے پمفلٹ خصوصیت سے تقسیم کئے جائیں گے، چونکہ اب ضلع بزم قائم ہو گئی ہے، اس لئے بزم اپنی قلیل سی آمدنی کا ½ حصہ ضلع بزم کو ادا کیا کرے گی۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

**۶۔ سیالکوٹ** پمفلٹ "من ویزداں"، تقسیم کیا گیا۔ مختلف احباب کی خدمت میں طلوعِ اسلام کا قرآنی لٹریچر بغرض مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ پروفیسر محمد دین صاحب بھٹی نے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ مقام محمدیؐ، کا پمفلٹ عید میلاد النبیؐ پر تقسیم کیا جائے گا۔

**۷۔ راولپنڈی** فکرِ قرآنی کے عام کرنے میں اراکین کا جوش و ولولہ تیزی سے تیز تر ہو رہا ہے۔ پمفلٹ مقام محمدیؐ، کی کاپیاں ممبران نے خود خرید کر اپنے اپنے حلقہ میں تقسیم کیں۔ دو کانداروں کی وساطت سے اس پمفلٹ کی رعایتی قیمت پر فروخت کا انتظام کیا گیا۔

**۸۔ جام پور** سیلاب کی وجہ سے پیدا شدہ حالات کی بنا پر، بزم کی جد و جہد پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ بایں ہمہ، اراکین نے اس اثر کو بہت جلد دبا کر الگ کر دیا۔ راولپنڈی کنونشن میں جو وعدہ کیا گیا تھا اس کی تکمیل کے لئے کوشش جاری ہے پڑھے لکھے طبقہ کو قرآنی فکر کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔

**۹۔ ڈیرہ غازی خاں** فیصلہ کیا گیا ہے کہ عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید، عید الفطر کی طرح حسن کارانہ انداز سے منائی جائے۔ اُمّتِ محمدیہ کو مقام محمدی سے روشناس کرا کر، انھیں پیام محمدیؐ پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دلائی جائے۔ تجویز ہے کہ شہر سے باہر طلوعِ اسلام ہال" تعمیر کیا جائے۔ اس کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ واللہ المستعان۔

**۱۰۔ جھنگ** بزم کی تگ و تاز کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ بزم کا دار المطالعہ صبح و شام باقاعدہ کھلتا ہے، اور اس میں حاضری بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگوں سے ذاتی طور پر مل کر ان کے شبہات دور کرنے کی اسکیم بڑی کامیاب ہو رہی ہے۔

**۱۱۔ پنج کسی** بزم کے اجتماع میں مختلف مضامین پڑھ کر سنائے اور سمجھائے جاتے ہیں۔ جن احباب کو لٹریچر دیا جاتا ہے، بعد میں ان سے مل کر ان کی رائے دریافت کی جاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ خدمتِ خلق کے سلسلہ میں حکیم احمد دین صاحب، آنکھ اور کان کی دوائی مفت دیتے ہیں۔

**۱۲۔ چک نمبر ۲۲۸** یہ دیہاتی علاقہ ہے۔ اس کے لئے سلسلہ یہ شروع کیا گیا ہے کہ پرویز صاحب کے مختلف مضامین کو پنجابی زبان میں سمجھایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہی لوگ، جو پہلے اس نام کو سننا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس مضمون کے خاتمہ پر از خود پورے شوق اور خلوص سے پرویز صاحب کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتے اور آئندہ اجتماع کے انعقاد کے لئے تاکیدیں کرتے ہیں۔ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں قرآن جیسی نعمت دی ہے۔

**۱۳۔ پشاور شہر** بزم کے اجلاس باقاعدہ ہر ہفتہ ہوتے ہیں۔ جناب پرویز کی تصانیف سے استفادہ حاصل کرنے والوں کا حلقہ بڑھ رہا ہے۔ پمفلٹوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری ہے۔

**۱۴۔ پشاور چھاؤنی** بزم کا ہفتہ واری اجلاس باقاعدہ ہوتا ہے اور اراکین بزم بڑی مستعدی سے قرآنی فکر کے نشر و اشاعت میں حصہ لیتے ہیں۔ پرانے اور نئے تمام پمفلٹوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری ہے۔

**۱۵۔ لائل پور** بزم نے انتظام کیا ہے کہ محترم پرویز صاحب کی ریکارڈ شدہ تقریر کے ٹیپ ریکارڈ سے انہیں اجتماعات میں نشر کیا جائے۔ چنانچہ اس کی ابتدا اس ماہ سے کر دی گئی۔ اس کا سامعین پر نہایت عمدہ اثر ہوا۔ اب اسے مختلف علاقوں میں نشر کیا جائے گا۔ اور ان تقاریر کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔ یہ طریق بہت مؤثر ثابت ہوا ہے۔

**۱۶۔ مردان** بزم کا اجلاس ۹ ستمبر کو رات کے آٹھ بجے ڈاکٹر ٹی۔ ایم۔ خان کے مکان پر منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل قرار دادیں پیش ہوئیں۔

۱۔ بزم ہر مہینے پانچ پرچے طلوع اسلام اہل ذوق اور تعلیم یافتہ حضرات کی خدمت میں اپنے خرچ سے مفت پیش کیا کرے۔ ہر دو تین ماہ کے بعد ان حضرات کی خدمت میں بزم کے ایک یا دو ممبر حاضر ہو کر ان سے تبادلۂ خیالات کرے اور اس لٹریچر کے متعلق ان کا ردِ عمل معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

۲۔ ایک محتاج طالب علم مسمیٰ ...... نے بزم سے درخواست کی ہے کہ اس کے امتحان کے اخراجات میں امداد کرنے کے لئے بزم کچھ رقم ماہوار بطور عطیہ منظور کرے۔ چنانچہ بزم نے اس کے جواب میں اپنے مختصر اور محدود فنڈ میں سے مبلغ دس روپے ماہوار ایک سال کے لئے منظوری دے دی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اسی طرح ایک دوسرے لائق لیکن محتاج طالب علم کو بزم مبلغ بیس روپے ماہوار

ایک بڑی مدت سے دے رہی ہے۔

"ادارہ" سے درخواست کی گئی کہ محترم پرویز صاحب کے مختصر مضامین بھی پمفلٹوں کی صورت میں اگر شائع ہوتے ہیں، تو یہ تحریک کے لئے بہت مفید ہو سکتے ہیں۔

روزنامہ "امروز" و "پاکستان ٹائمز" سے رابطہ قائم کر کے "ادارہ" کو اس میں محترم پرویز صاحب کے درس کا باقاعدگی کے ساتھ اعلان کرنے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ تاکہ متعلقہ حضرات کو اس طرح درس کی اطلاع ملتی رہے۔

## ۱۷۔ چارباغ ضلع مردان

طلوع اسلام کا لٹریچر ڈپو کے ملازمین میں باقاعدگی کے ساتھ تقسیم ہو رہا ہے۔ ہر ایک سے فرداً فرداً بھی تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا رہتا ہے۔

(۲) اس ماہ پرچے کے سرورق پر دو صحیح احادیث کا اندراج بہت پسند کیا گیا۔ کبھی کبھی صحیح احادیث کا سرورق پر اندراج بہت ضروری ہے تاکہ لوگ ایک طرف اس کی افادیت سے مستفید رہیں اور دوسری طرف عوام کے ذہن سے یہ خیال بھی جاتا رہے کہ طلوع اسلام احادیث کا منکر ہے۔

## ۱۸۔ بزم پنجن لوقہ

یہ علاقہ تعلیمی لحاظ سے بہت واماندہ ہے۔ تعلیمیافتہ حضرات خال خال موجود ہیں۔ چنانچہ اس کشت بے نم میں فکر ریزی کے لئے مسلسل تگ و دو کی ضرورت ہے۔

(۲) طلوع اسلام کا لٹریچر مختلف دیہات میں پھیلا رکھا ہے۔ بزم کا ہر فرد جہاں بیٹھتا ہے قرآنی احکام لوگوں پر آشکار کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے لیکن یہ ایک صبر آزما اور حوصلہ طلب امر ہے۔

(۳) گاہے گاہے بزم کا اجتماع ہوا کرتا ہے اس میں کئی سوالات اور خلش ہائے دل کا مداوا کیا جاتا ہے۔ اپنے پروگرام کو موثر بنانے کے لئے تدابیر سوچی جاتی ہیں۔

(۴) بزم پنجن نے بزم چارباغ سے بھی اپنا رابطہ قائم رکھا ہے۔ ہماری بزم کے اراکین مہینے میں ایک بار وہاں تبادلۂ خیالات کے لئے جاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بزم اپنی ب ط کے لحاظ سے ــــ ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے دگر ــــ کے مصداق ہے لیکن ک، ا، ہوتے ہوئے بھی قرآنی آواز کو عام کرنا اپنا نصب العین حیات سمجھتی ہے۔

## توجہ طلب

بزم لائل پور نے یہ بھی لکھا ہے کہ فرقہ اہل قرآن کے بعض حضرات بزموں میں شریک ہو کر اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دیتے ہیں جس کا طلوع اسلام کی تحریک پر برا مضر اثر پڑتا ہے۔ بزمیں اس سے متنبہ رہیں۔

## منظور شدہ بزمیں

## ضلع بزم جہلم

منظور شدہ بزموں کی فہرست میں، ضلع بزم جہلم کا اضافہ کر لیجئے۔

سید محمد حسین شاہ صاحب۔ ڈویژنل سرویر۔ محکمہ جنگلات۔ ۱۲ سول لائن۔ جہلم۔ اس کے ... منتخب ہوئے ہیں۔

# صالحین کے کارنامے

## (جیل میں طلوعِ اسلام کی یاد)

جماعت اسلامی کے اعلیٰ طبقہ کے کارکنوں کی جماعت سے علیحدگی سے خلق خدا کو ایک فائدہ ضرور ہوا ہے۔ اس سے جماعت کے کچھ ایسے رازہائے درون پردہ کا انکشاف ہو رہا ہے جو بصورت دیگر کبھی لوگوں کے سامنے نہیں آسکتے تھے۔ المنیر (لائلپور) کی ایک سابقہ اشاعت میں مدیر جناب محترم عبدالرحیم اشرف صاحب نے لکھا تھا کہ مودودی صاحب نے مرکزی شوریٰ کے ایک اجلاس میں یہ فتویٰ صادر فرمایا تھا کہ روپے دیکر ووٹ حاصل کرنا جائز ہے اور دلیل کے طور پر قرآن کی ایک آیت بھی پیش کی تھی۔ المنیر کی حالیہ اشاعت (۱۹ ستمبر) میں کراچی کے ایک صاحب کا خط شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ مودودی صاحب نے اجتماع کارکناں (منعقدہ کراچی) میں اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ "جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد یہ لوگ اتنے گر گئے ہیں کہ انھیں خدا اور رسول تک کا خوف نہیں رہا اور اب اس قسم کے الزامات لگانے پر اتر آئے ہیں"۔ مدیر المنیر کی طرف سے اس کا جو جواب شائع ہوا ہے وہ اس قابل ہے کہ قارئین طلوعِ اسلام اسے ان کے الفاظ میں دیکھیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

" آپ کے گرامی نامہ کے جواب میں عرض ہے۔

(۱) روپیہ دیکر ووٹ حاصل کرنے کے سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب کے بارے میں المنیر میں جو لکھا گیا ہے وہ ایک واقعہ ہے جو مرکزی شوریٰ کے ایک اجلاس میں ظہور پذیر ہوا۔ اصل قصہ یوں ہے کہ بہاولپور کے گذشتہ انتخابات کے موقع پر وہاں کی جماعت نے بعض ایسے اقدامات کئے تھے جو مرکزی پالیسی کے خلاف تھے ان میں حسب ذیل امور خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔

(الف) ووٹروں کے لئے سواریاں مہیا کی گئیں (ب) ووٹروں کو کھانا کھلایا گیا۔ (ج) بعض ووٹروں کو نقد [illegible] گئے۔

یہ تینوں باتیں متعدد بار مرکزی شوریٰ میں زیر بحث آئیں۔ اسی دوران بعض امور کے متعلق جماعت بہاولپور نے مرکز سے [illegible] بھی کئے۔

ایک شوریٰ میں دوران بحث معلوم ہوا کہ ووٹروں کے لئے سواریاں مہیا کرنے کے سلسلے میں امیر جماعت سے ان کے دورہ بہاولپور کے موقعہ پر اجازت حاصل کی گئی تھی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ووٹروں کو جو نقد پیسے دیئے گئے تھے وہ نشے پانی کے لئے تھے۔ اسی طرح یہ انکشاف بھی ہوا کہ انتخابات جو حسابات جماعت بہاولپور نے الیکشن کمشنر کو دیئے وہ درست نہ تھے اور یہ اس لئے کہ اگر صحیح حسابات دیئے جاتے تو مصارف سرکاری متعینہ رقم سے

زیادہ تھے اور اس سے جماعت کے خلاف پٹیشن کامیاب ہو سکتی تھی۔

نقد پیسوں کے متعلق امیر جماعت نے فرمایا کہ دراصل واقعہ یہ ہوا تھا کہ دو ممبروں کو صبح سے شام تک پولنگ سٹیشن پر بیٹھنا پڑا تھا اس لئے انھیں کھانے وغیرہ کے لئے پیسے دیئے گئے تھے۔۔۔ اس پر ایک رکن شوریٰ نے کہا تھا کہ یہ بات سوچنے کی ہے کہ اگر فریق مخالف ووٹروں کو تنگ کرنے کے لئے انھیں پورا دن پولنگ پر رکھے تو غریب لوگوں کو ایک دن کی اجرت کے طور پر ... دیدینے میں کیا حرج ہے؟

ایک دوسرے صاحب نے فرمایا کہ آخر اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے اس میں حرج ہی کیا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اس موقعہ پر امیر جماعت نے فرمایا کہ قرآن مجید میں مؤلفۃ القلوب کا جو حصہ رکھا گیا ہے اس کا مصرف یہ لوگ کیوں نہیں ہو سکتے؟

میں نے اس پر ایک سرد آہ بھری اور ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا۔ اس کے بعد ہی شوریٰ کے موقعہ پر شوریٰ کے اجلاس کے باہر اکثر ارکان شوریٰ کے سامنے میں نے اس بات کا بڑے افسوس کے ساتھ ذکر کیا کہ اب ہم ان باتوں کے لئے قرآن سے استدلال کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ یہ واقعہ مجھے صرف یاد ہی نہیں، اس کی درد اور ٹیس بھی اس وقت سے آج تک اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔

(۳) ممکن تھا میں اس واقعہ کو وہ اہمیت نہ دیتا جو میں نے دی اور اسے محض ایک نامناسب وقتی لغزش سمجھ کر نظر انداز کر دیتا لیکن میرے سامنے ایک ... واقعہ بھی تھا ... یہ کہ

... ۱۹۵۴ء کو ... میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے ... ہدایات لیں اس موقعہ پر بعض دوسرے امور کے ... سنت کے فتنے اور ان کی کوششوں کا بھی ذکر آیا۔ اس پر مولانا ممدوح نے اشاعت لٹریچر کی ایک اسکیم بتلائی اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں فرمایا کہ آپ چوہدری غلام محمد صاحب سے کہیں کہ وہ دفتر طلوع اسلام سے رابطہ پیدا کریں اور وہاں کسی شخص کی تالیف قلب کر کے اس سے طلوع اسلام کے پتے حاصل کریں۔ اور یہ لٹریچر ان پتوں پر مفت ارسال کیا جائے۔

میں نے چوہدری صاحب موصوف سے مولانا کی اس تجویز کا ذکر کیا تو انھوں نے اس انداز سے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ یہ بات اس سے پہلے بھی ان تک پہنچ چکی ہے ۔۔۔ اب یہ بات چوہدری صاحب کے علم میں ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اس پر عمل بھی کیا ہے یا نہیں بعض واقعات سے میرا گمان ہے کہ یہ پتے حاصل کئے گئے ہیں۔"

طلوع اسلام: آگے بڑھنے سے پیشتر اتنا سننے جائیے کہ یہ چوہدری غلام محمد صاحب وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد کے ایک ماہ وار اخبار کا خط شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ

کافی عرصہ پہلے مجھے چوہدری غلام محمد قیم جماعت اسلامی صوبہ سندھ نے کہا تھا کہ جناب پرویز کو مرکز نے ایک لاکھ کی امداد دینی منظور کی ہے جس میں سے بیس ہزار مل چکے ہے اور باقی ملنی ہے۔

اس خط کے موصول ہوتے پر ہم نے چوہدری غلام محمد صاحب کو بصیغۂ رجسٹری ایک خط بھیجا جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ کیا انھوں نے ایسی بات کہی ہے اور اگر کہی ہے تو اس کا ان کے پاس کیا ثبوت ہے۔ اس خط کا کوئی جواب چوہدری صاحب کی طرف سے موصول نہیں ہوا۔

البتہ ہم نے اپنے خط میں' جواب کے لئے جو ساڑھے پانچ آنے کے ٹکٹ رکھے تھے، وہ واپس آ گئے تھے (تاکہ صالحین کی دیانت پر آنچ نہ آنے پائے)

یہ ہیں وہ چوہدری صاحب جنہیں مودودی صاحب نے اس 'جہادِ عظیم' کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ یقیناً وہ اس مہم کو سر کرنے کے قابل تھے![1]

اس کے بعد مدیر المنبر نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ مودودی صاحب نے "مولفۃ القلوب" کی جو تفسیر اپنی کتاب تفہیم القرآن میں درج کی ہے اس سے بھی ان کی اسی ذہنیت کا ثبوت ملتا ہے (کہ وہ تالیفِ قلوب کو رشوت ہی سمجھتے ہیں۔ طلوع اسلام)

اس کے بعد مدیر المنبر نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ

"رہا یہ موضوع کہ مولانا ممدوح نے فرمایا ہے کہ "جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد یہ لوگ اتنا گر گئے ہیں کہ اب انھیں خدا اور رسول کا خوف تک نہ رہا" تو میں اس کے جواب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ مولانا نے یہ بات فرما کر کسی نئی بات کا اضافہ نہیں فرمایا۔ وہ کم از کم دو برس سے علیحدہ ہونے والوں کو رجب کہ وہ ابھی جماعت میں تھے اور ان سے صرف یہی جرم سرزد ہوا تھا کہ وہ مولانا سے اختلاف کر رہے تھے) نجوٰی کے مرتکب، ضعفِ ارادہ مرکب ...... کے مریض، یک رخے، تحریک اسلامی کے نادان دوست، جماعت کے غدار، اقامتِ دین کی جد و جہد کے روڑے، خدا کے خوف سے عاری، خائن، انتشار پسند اور نہ معلوم کیا کیا کچھ ثابت کر رہے ہیں۔ اگر مولانا محترم کی مہم میں کوئی کسر ابھی باقی ہے تو وہ اسے پورا کر لیں۔ علیحدہ ہونے والے آخر اس بات کے تو مجرم ہیں ہی کہ انھوں نے مولانا مودودی صاحب کی دعوت کو کتابوں میں پڑھ کر ہی لبیک کہہ دیا اور ایک طویل عرصہ تک اہم ترین امور پر اختلاف کا اظہار صرف شوریٰ میں کرتے رہے اور اقامتِ دین کی جد و جہد کے احترام اور جماعتی ڈسپلن کی پابندی کی وجہ سے انھوں نے یہ غلط پالیسی اختیار کی کہ جن باتوں کی وہ شوریٰ میں شدید مخالفت کرتے تھے۔ جب اکثریت رائے سے فیصلے ان کے خلاف ہوتے تو یہ لوگ شوریٰ سے باہر آ کر اس طرح ان فیصلوں کی تائید کرتے کہ انھیں نہ صرف یہ کہ ان سے اختلاف نہیں۔ بلکہ وہ ان کے زبردست مؤید و حامی ہیں ۔۔۔ بہت اچھا ہوا کہ اس جرم کی سزا ان لوگوں کو خود مولانا کے ہاتھوں اسی دنیا میں مل گئی ۔۔۔ رہے مولانا تو ہم دل سے دعا کرتے ہیں، اللہ رب العزت ان کی فکری و عملی غلطیاں ان پر واضح فرمائے اور انھیں توفیق دے کہ وہ دین کے لئے کوئی مضر پہلو اختیار کرنے کے بجائے دین کے خادم کی حیثیت سے اپنے رب کے پاس جائیں۔"

طلوع اسلام: اس سے یہ ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک، یہ علیحدہ ہونے والے حضرات جھوٹے اور پست کردار کے مالک ہیں۔ اور علیحدہ ہونے والوں کے نزدیک مولانا مودودی جھوٹے ہیں۔ ہمیں ان حضرات کی اس جنگ میں نہ کسی کی مخالفت سے غرض ہے نہ موافقت سے واسطہ۔ البتہ ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ جہاں تک ان، علیحدہ ہونے والے، حضرات کا تعلق ہے، یہ وہی ہیں جن کے متعلق مودودی صاحب نے (اپنی سرگودھا کی تقریر میں ۱۹۵۱ء میں) فرمایا تھا کہ

---

[1] کراچی کے ادارۂ تحقیقِ حق نے طلوع اسلام کے خریداروں کے پتے جس انداز سے سرقہ کئے تھے اس کا ذکر طلوع اسلام کے صفحات میں پہلے آ چکا ہے۔ "صالحین" ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔

اس وقت جماعت اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں۔ پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے کہ اس نے اس ملک میں قابل اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی ہمارے ملک کو اس وقت سب سے بڑی ضرورت ہے ..... جماعت اسلامی کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ دیکھے کہ اس (دینی پاکستانی مسلمانوں کی) سیرت و کردار والی قوم میں کہاں کہاں قابل اعتماد سیرت و کردار والے لوگ موجود ہیں۔ آج بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ ایسے مضبوط کیریکٹر والے لوگوں کو منظم کیا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کچھ قابل اعتماد لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں۔

(بحوالہ الاعتصام ۱۵-۶/۱۹۵۵)

اس سے ظاہر ہے کہ اگر یہ لوگ ایسے قابل اعتماد سیرت و کردار کے حامل تھے کہ مودودی صاحب نے انھیں چن چن کر اپنے گرد جمع کیا تھا، تو وہ ان کے متعلق جو کچھ اب کہہ رہے ہیں وہ جھوٹ ہے۔ اور اگر یہ حضرات فی الواقع ایسے ہیں جیسے مودودی صاحب انھیں اب بتا رہے ہیں، تو انھوں نے ان کے متعلق پہلے جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ تھا۔ یا قابل اعتماد سیرت و کردار کا معیار یہ ہے کہ جو شخص مودودی صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے اس کا کردار قابل اعتماد ہوتا ہے۔ اور جب وہ اس سے اختلاف کرے تو اس کا کیرکٹر بہت پست ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر مودودی صاحب نے اُس وقت یا اب جھوٹ بولا ہے تو اس میں کونسی بُری بات ہے جبکہ انھوں نے خود ہی فتویٰ دیا ہے کہ بلند مقصد کے حصول کے لئے جھوٹ بولنا اور فریب دینا نہ صرف شرعاً جائز ہوتا ہے بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔

آسمان کی آنکھ نے "اقامت دین" کے اس قسم کے علمبردار بھی کم دیکھے ہوں گے۔


# انسان نے کیا سوچا

از پرویز

زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ قیمت دس روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گل برگ - لاہور

## ضرورت رشتہ

ایک تعلیم یافتہ صاحب کے لئے جن کی آمدنی -/۲۲۰ روپے ماہوار ہے۔ رشتہ کی ضرورت ہے۔
لڑکی جوان عمر بیوہ ہو۔ ضرورت مند حضرات مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں۔
حسن دین کلرک اپر ڈویژن۔ سیکشن ای ۲ دفتر چیف انجینئر جنوبی۔ کراچی

# پیش کش برائے طباعت لغات القرآن

**حاجی محمد دین صاحب**

زیرِ نظر فہرست میں وہ رقوم درج کی جاتی ہیں جو مختلف افراد یا بزموں کی طرف سے موصول ہو رہی ہیں۔ اس امداد سے ان حضرات کا مقصد یہ ہے کہ لغات القرآن کی طباعت کا کام جلد از جلد تکمیل کو پہنچ جائے۔ بعید از سپاس گزاری ہوگا اگر اس ضمن میں محترم حاجی محمد دین صاحب (گجرات۔ کراچی) کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس زمانے میں ابھی لغات کی تدوین کا کام ہو رہا تھا انہوں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور اسے جلد از جلد تکمیل تک پہنچانے کے لئے ڈیڑھ سال تک سٹاف کا خرچ برداشت کیا جو مجموعی طور پر دس ہزار روپے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے یہ کام بہت کم عرصہ میں مکمل ہو گیا۔ لہٰذا حاجی صاحب محترم ان معاونین کی فہرست میں السابقون الاوّلون میں سے ہیں۔

## —— فہرست پیش کش ——

اس فہرست میں

(۱) ان وعدوں کی جو کلیتہً ایفا ہو چکے ہیں، صرف میزان دی گئی ہے۔ اور

(۲) جو وعدے ابھی پورے نہیں ہوئے ان کی تفصیل دی گئی ہے۔

### انفرادی پیش کش

| نام | وعدہ | وصولی | بقایا |
|---|---|---|---|
| ڈاکٹر رضا محمد خان (مردان) | 500 | 200 | 300 |
| ابو الاثر حفیظ جالندھری | 1000 | × | 1000 |
| خواجہ رسول بخش دادن خان | 100 | × | 100 |
| محمد اسحٰق میر۔ دہران | 200 | 88 | 112 |
| میزان | 1800 | 288 | 1512 |

—— وعدے جو پورے طور پر ایفا ہو چکے ہیں ——

| | وعدہ | وصولی | بقایا |
|---|---|---|---|
| | 21,719/8 | 21,719/8 | |
| میزان | 23,519/8 | 22,007/8 | 1512 |

(بزمیں)

| نمبر شمار | مقام | وعدہ | وصول | بقایا | نمبر شمار | مقام | وعدہ | وصول | بقایا |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | شادر آباد | 100 | - | 200 | ۱۳ | سیالکوٹ | 5,000 | 2,000 | 3,000 |
| ۲ | کوئٹہ | 150 | | 150 | ۱۴ | دیوبہ سنڈی | 200 | 175 | 25 |
| ۳ | ٹنڈو محمد خاں | 200 | | 200 | ۱۵ | واہ چھاؤنی | 675 | 425 | 250 |
| ۴ | جام پور | 200 | | 200 | ۱۶ | لاڑکانہ | 300 | 125 | 175 |
| ۵ | اسعید قطر (سعودی عرب) | 900 | | 900 | ۱۷ | اوکاڑہ | 1,000 | 600 | 400 |
| ۶ | قاضیاں | 300 | | 300 | ۱۸ | گوجرانوالہ | 200 | - | 200 |
| ۷ | ڈیرہ غازی خاں | 250 | 200 | 50 | ۱۹ | لاہور | 5,000 | 630 | 4,370 |
| ۸ | لائل پور | 500 | 400 | 100 | ۲۰ | ایبٹ آباد | 200 | | 200 |
| ۹ | سرگودھا | 500 | | 500 | | میزان | 18,225 | 6340 | 11,885 |
| ۱۰ | جھنگ | 500 | 100 | 400 | | کار[illegible] | | | |
| ۱۱ | پشاور | [illegible],000 | 2,000 | 340 | | | [illegible] | [illegible] | |
| ۱۲ | ٹیکسلا | 50 | 25 | 25 | | میزان | 28,241 | 16,356 | 11,885 |

## میزان کل:-

| | وعدے | رقم موصولہ | بقایا |
|---|---|---|---|
| بزمیں | 28,241 | 16,356 | 11,885 |
| انفرادی | 23,519/8 | 22,007/8 | 1,512 |
| | 5[illegible],760/8 | 38,363/8 | [illegible]3,397 |

# انتہائی کم قیمت پر بہترین کپڑا

# 96000

اعلیٰ درجہ کی سفید شرٹنگ

مرغا چھاپ سفید شرٹنگ

دل چھاپ ساٹن ڈرل وغیرہ

میسرز علی محمد اسماعیل 39A/S موتی جیٹھا مارکیٹ۔ کراچی

سیلز

مل اونرز ریٹیل کلاتھ مارکیٹ، پرانی نمائش

اسٹال:- بندر روڈ ایکس ٹینشن کراچی سے بھی مل سکتا ہے

# داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ۔ کراچی